فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	نبیؐ کے لئے اللہ کا اندازِ تخاطب	نصرت محمود قریشی	8
قولِ نبیﷺ	باہمی تعلقات	عصمت اسامہ حامدی	11
خاص مضمون	رحمت اللعالمین کا معاشی اسوہ حسنہ	پروفیسر محمد اکرم طاہر	14
نوائے شوق	سیدہ عائشہؓ	شمیم فاطمہ	20
	غزل	کرامت بخاری	20
	غضب کی ناگہانیاں	نجمہ یاسمین یوسف	21
	غزل	حبیب الرحمٰن	22
	غزل	ذکیہ فرحت	22
حقیقت و افسانہ	گواہی	ربیعہ ندرت	23
	دوسرا راستہ	ام ایمان	27
	زمین پر قدم	قانتہ رابعہ	31
	اپنا اپنا امتحان	رخسانہ اقبال راوٗ	34
	وہی روٹین	مریم شہزاد	36
انتخاب	بسو کی ماں	دلشاد نسیم	38
سیرو سیاحت	نیویارک میں چند روز	صائمہ اسما	42
ہلکا پھلکا	خطہ لاہور	محمد صفدر بشیر	48
نہاں خانہ دل	آوٗ زندگی کا نصاب بدلیں	افشاں نوید	52
	میرے بچپن کے دن	عافیہ رحمت	56
خفتگانِ خاک	کنیز حاضر ہے	شمیرا شاہد	59
محشر خیال	ڈاکٹر سمیحہ راحیل، کرامت بخاری، رخسانہ اقبال، فرحت طاہر، خورشید بیگم	افشاں نوید	62
بتول میگزین	عابدہ فرحین، افشاں نوید، شمیم لودھی، ام صائم، رفعت اعجاز، صائمہ وحید، رضوانہ بتول		66
مطالعہ گاہ	تبصرہ کتب	ڈاکٹر شازیہ عاشق	70
	اشاریہ ماہنامہ بتول	آسیہ راشد	72
گوشہِ تنسیم	خاتونِ اول	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	79

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! نئے عیسوی سال کا آغاز ہے۔ اللہ کریم اس سال کو ہماری ذاتی اور قومی زندگیوں میں خیر و برکت، عافیت اور خوشیوں کا سال بنائے، آفات اور آزمائشوں سے محفوظ رکھے اور اپنا فضل و کرم شاملِ حال رکھے آمین۔

سالِ گزشتہ کئی سانحے اور حادثے دے کر وقت کے لامتناہی سمندر میں ضم ہوگیا۔ کرۂ ارض کو مزید جنگوں اور تباہیوں کے حوالے کر گیا، روتی کرلاتی نسلِ انسانی کو دکھوں اور غموں کی اتھاہ میں کچھ اور گہرا گاڑ گیا، انسانیت اور زوال آشنا ہوئی، شیطانیت اور پھلی پھولی، ایک طرف وہ ہیں جو اپنے ہی ہم مذہبوں اور بھائی بندوں کو 'فتح' کر رہے ہیں اور دوسری طرف وہ ہیں جو ان سے دنیا کو 'بچانے' کا دعویٰ لے کر اپنے شرمناک سیاسی معاشی اور نظریاتی مفادات حاصل کرنے کی راہ پر گامزن ہیں۔ دونوں صورتوں میں امت مسلمہ کے بے گناہ افراد بے حد وحساب مر رہے ہیں، اپنے ہی وطنوں میں بے گھری کا عذاب سہہ رہے ہیں، یا ہجرت پر مجبور ہیں۔ اسرائیل کے ہاتھوں فلسطینیوں پر اور بھارتی فوج کے ہاتھوں کشمیریوں پر ہوتا ظلم دیکھتے دیکھتے برما میں مسلمانوں کا قتلِ عام اس منظر نامے کا حصہ بن گیا۔ افغانستان اور عراق اب تک خانہ جنگی سے باہر نہیں نکلے تھے کہ شام خون آشام ہوگیا، مصر میں شہریوں پر ریاست چڑھ دوڑی، اور لیبیا سکون کا سانس نہیں لے سکا تھا کہ اردن میں محاذ جنگ کھل گیا۔ غرض کہ مسلم دنیا کا کثیر حصہ اس وقت تباہی کا شکار ہے۔ کسی مغربی ملک میں کوئی پراسراری واردات ہوتی ہے، پھر چوبیس گھنٹوں کے اندر اتحاد بن جاتے ہیں، فوجیں کھڑی ہوجاتی ہیں اور اس کی پاداش میں جائے وقوعہ سے دور .... بہت دور.... کہیں مسلم دنیا کے کسی کونے میں..... امن سے رہتے.... سنہرے مستقبل کے خواب بنتے.... معصوم شہریوں پر بمباری شروع کردی جاتی ہے۔ سکولوں میں پڑھتے اور گلیوں میں کھیلتے بچے، آنگنوں میں آرام کرتے بزرگ، گھروں کو سمیٹتی عورتیں، حصول رزق میں مصروف مرد، یہاں تک کہ ہسپتالوں کی نرسریاں جہاں چند گھنٹوں کے نومولود انکیوبیٹرز میں ابھی سانس لینا سیکھ رہے ہوتے ہیں، انتقام کا نشانہ بنا دیے جاتے ہیں۔ اللہ رب العزت فرماتا ہے ''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، حقیقت میں یہی مفسد ہیں۔''

ان وارداتوں کے نتیجے میں مغرب میں بسنے والے مسلمان جس عتاب کا نشانہ بنتے ہیں وہ ایک الگ داستان ہے۔ ان کو امتیازی رویوں کا گھونٹ گھونٹ زہر دے کر مارا جاتا ہے، ڈونالڈ ٹرمپ جیسے نفرت کے سفیروں کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ امکانات کے بیج بوئیں اور کسی ممکنہ انتہائی اقدام کے لیے اپنے معاشروں کو تیار کریں۔

پاکستان خود اس پیچیدہ صورتحال کے شاخسانے اب تک سہہ رہا ہے۔ فوجی آپریشن کے نتیجے میں بہتری آئی ہے اگرچہ ماضی کی حکمت عملی جو نقصانات پہنچا چکی ہے ان کا تدارک اتنا آسان نہیں۔ دسمبر میں سانحہ پشاور کے شہدا کی یاد ملکی سطح پر منائی گئی۔ غم و غصے اور صدمے سے بھرے ہوئے دلوں کو دشمن کے بچوں کو پڑھانے کا عزم دے کر اس منفی قوت کے مثبت استعمال کی ترغیب دی گئی۔ یہ بے حد قابلِ تحسین ہے۔ کیونکہ کسی اپنے کے بے گناہ مارے جانے کا غصہ جب انتقام کی شکل اختیار کرتا ہے تو انسان انسان نہیں رہتے، بم بن جاتے ہیں۔ سب انسانیت، تعلیم، گناہ ثواب بھول جاتا ہے۔ آرمی پبلک کے معصوم بچے جس انتقام کا نشانہ بنے ہیں کون جانے یہ انتقام کہاں سے پھوٹا تھا، سانحۂ باجوڑ سے، جامعہ حفصہ سے، یا بلا امتیاز کیے

گئے ڈرون حملوں سے۔اور کون تھا جو ان کے صدمے کو مثبت شکل دیتا، صحیح سمت دکھاتا، البتہ وہاں دشمن ضرور دوست بن کر موجود تھا جو اس غم کو مرکز گریز قوت کی شکل میں منظّم کرتا رہا۔آج ہمیں اسی دشمن کا سامنا ہے جو سرحدوں کے باہر بھی ہے اور اندر بھی۔

سعودی عرب کا بنایا ہوا فوجی اتحاد ایک سے زیادہ وجوہات کی بنا پر متنازعہ ہے۔پاکستان کی اس میں شرکت کا فیصلہ پارلیمنٹ میں بحث کے بعد ہونا چاہیئے۔کوئی بھی ایسا منصوبہ جو امتِ مسلمہ کے انسانی اور مادی وسائل کو آپس ہی میں دست و گریباں کر کے بربادی پھیلانے کا باعث ہو، کسی خیر کا موجب نہیں ہوسکتا۔خارجی کے ساتھ ساتھ یہ داخلی سلامتی کے لیے بھی بے حد اہم ہے۔یہ پوری قوم کو ساتھ لے کر چلنے کا وقت ہے۔حکومت کو چاہیئے کہ اس نازک معاملے پر رائے عامہ اور قومی مفادات کو ترجیح دیتے ہوئے کوئی موقف اختیار کرے تاکہ پہلے کی طرح عوام تقسیم نہ ہوں اور انتشار نہ پھیلے۔

کل تاریخ یقیناً خود کو دہرائے گی ۔۔۔ آج کے اک اک منظر کو پہچان میں رکھنا
بزم میں یاروں کی شمشیر لہو میں تر ہے ۔۔۔ رزم میں لیکن تلواروں کو میان میں رکھنا
آج تو اے دل ترکِ تعلق پر تم خوش ہو ۔۔۔ کل کے پچھتاوے کو بھی امکان میں رکھنا
اس دریا سے آگے ایک سمندر بھی ہے ۔۔۔ اور وہ بے ساحل ہے یہ بھی دھیان میں رکھنا

اور اب کچھ بات بتول کے مواد کی ہو جائے۔''بتول میگزین'' کے نام سے ہمارا ایک کالم موجود ہے جس میں ایسی تحریریں شامل کی جاتی ہیں جو مختصر لیکن پُر اثر ہوں۔یا وہ تحریریں جو طوالت کے باعث اپنا تاثر خراب کر رہی ہوں ان کو مختصر کر کے کام کی بات نکال لی جاتی ہے۔ہماری کوشش ہے کہ ہمیں کم سے کم تحریروں کو مسترد کرنا پڑے۔اسی لیے ہر قسم کی تحریر کو ایڈجسٹ کرنے کے لیے کالموں کی ورائٹی رکھی گئی ہے۔اگرچہ اس میں مدیرانہ مشقت بہت بڑھ جاتی ہے مگر ہمارے کئی لکھنے والے اسی مرحلے سے تیار ہوتے ہیں۔ساتھ ہی کہنہ مشق لکھنے والوں کی مختصر تحریروں سے استفادے کی بھی گنجائش نکل آتی ہے۔اس کالم کا حصہ بننے کے لیے تحریر مختصر اور جاندار ہونی چاہیئے۔کوئی کام کا نکتہ، کوئی پتے کی بات، شگفتہ پیرائے میں کوئی نثر پارہ، چھوٹا سا قصہ یا چند باوزن اشعار۔

دسمبر کا سارا مہینہ ہماری تاریخ کے دو دکھ بھرے واقعات کی گونج نمایاں رہی۔۱۶ دسمبر چوالیس سال قبل سقوطِ ڈھاکہ سے لے کر سانحہ پشاور تک ایک ہی دشمن اور ہماری ایک سی غلطیوں کی علامت بن گیا ہے۔مجرموں پر نہ کل ہاتھ ڈالا گیا اور نہ اب کوئی خبر ہے۔حقائق پر کل بھی پردہ تھا اور آج بھی ہے۔مگر پردے ڈالنے سے حقائق کب چھپتے ہیں! درد کا ازالہ کب ہوتا ہے۔۔۔آنکھوں کے آگے سے مناظر کب ہٹتے ہیں! شمیم فاطمہ کے ان اشعار کے ساتھ اجازت کی طلب گار ہوں:

پھر یاد تری دل کے دریچے میں کھڑی ہے
پھر آج نگاہوں میں نمی تیر رہی ہے
وہ حادثہ آنکھوں میں ابھی گھوم رہا ہے
کانوں میں وہی چیخ ابھی گونج رہی ہے

دعا گو

صائمہ اسما

نبیؐ کیلئے اللہ کا اندازِ تخاطب

اَلْمُزَّمِّلُ

قرآن حکیم کی سورہ نمبر 73 میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو اس نام سے مخاطب کیا ہے۔

یَا اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ مطلب ہے ''اے چادر اوڑھنے والے'' یا لسان العرب کے مطابق ''اے چادر میں ملفوف!'' ویسے تو اس نام کا کوئی خاص معانی نہیں۔لیکن جب یہ نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریمؐ کو دیا گیا اور جس لاڈ سے بات کہی گئی اور جس وجہ سے کہی گئی، اس نام میں دنیا جہاں کا حسن اور زینت سما گئی یہ ایسے ہی ہے جیسے نبی کریمؐ نے علیؓ کو ابوتراب (خاک کا باپ) کا لقب دیا تھا۔لیکن جس لاڈ سے نبی کریمؐ نے علیؓ کو ابوتراب کہا تھا اس کی وجہ سے علیؓ کو اپنی یہ کنیت بہت ہی پسند تھی۔

دراصل جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریمؐ چادر اوڑھ کر لیٹے ہوئے تھے۔اللہ تعالیٰ نے کہا،''اے چادر اوڑھ کر لیٹنے والے!(اب یہ چادر وادر چھوڑ و اپنے آرام کو تھوڑا کم کرو رات بے شک آرام کرنے کے لیے ہے لیکن) تم رات کے وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے رہو (قیام کرو) چاہے تھوڑا ہو آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ۔''

اس لاڈ سے دیئے جانے والے حکم کی وجہ یہ تھی جو اللہ تعالیٰ نے اس سے اگلی آیت میں بیان کی ہے۔فرمایا:''بے شک ہم تمہاری طرف ایک ایسا قول (فرمان، حکم) القا کرنے والے ہیں جس کو بجالانا، پورا کرنا ایک بہت ثقیل (بھاری اور مشکل کام) ہوگا۔'' (73:1-5) اس بھاری کام کو سرانجام دینے کے لئے رات کو جاگنے اور قیام کی ذہنی اور جسمانی ایکسر سائز کی سخت ضرورت تھی۔ جیسے فوج میں جانے کے خواہشمند بچے ذہنی اور جسمانی ایکسر سائز کی ٹریننگ کے لئے اکیڈمیز میں داخلہ لیتے ہیں کیونکہ فوج کی ڈیوٹی نہایت ثقیل (بھاری) کام ہوتا ہے۔اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مختلف آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ذہنی طور پر نہایت چوکس رہنا پڑتا ہے۔ایسے ہی تو:

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

کے مصداق فوجی تیار نہیں ہوجاتے۔پھر انہیں اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کے دشمنوں سے نبردآزما ہونا پڑتا ہے اندرونی دشمن نفس امارہ اور وسوسے ڈالنے والے شیاطین جن اور یقین کیجئے اس دشمن سے نبی بھی مبرا نہیں تھے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں''اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے انسان اور جن بطور دشمن پیدا کر رکھے ہیں'' (6:112) لیکن ہمارے نبی کریمؐ کو تو اللہ کی فوج کا صرف سپاہی ہی نہیں بننا تھا بلکہ حزب اللہ کا سپہ سالار بننا تھا۔اس لئے ان کی ذہنی اور جسمانی ٹریننگ تو عام مسلمانوں سے بہت زیادہ سخت مشکل بھاری تھی جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو دیا۔اسی لیے تہجد کی نماز نبی کریمؐ کے لیے فرض تھی اور عام مسلمانوں کے لئے نفل۔اب تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بہت ہی خوبصورت اور محترم نام ہے جو رب نے اپنے بندے محمدؐ کو دیا۔

اَلْمُدَّثِّر

یہ نام بھی اللہ تعالیٰ کے لاڈ پیار کا مظہر ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ماؤں نے بھی اللہ تعالیٰ کے اس طرز تخاطب کو اپنایا ہوا ہے۔جب وہ یہ کہتی ہیں اٹھ میرے سوہنے سوتل (سونے والے)!بستر کو چھوڑ!تگڑا ہو جا! آج تو نے امتحان دینے جانا ہے۔یا آج تو نے فلاں مہم پر جانا ہے وغیرہ وغیرہ۔

دراصل یہ نام اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو اس وقت دیا تھا۔جب

انہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا، ''زَمِّلُوۡنِیۡ زَمِّلُوۡنِیۡ'' اور گھر والوں نے ان کے حکم کی تعمیل میں انہیں موٹا کپڑا (کمبل) اوڑھا دیا۔

یہ الفاظ نبی کریمؐ نے کیوں اور کب کہے؟ آپ میں سے اکثر کو غارِحرا میں جانے کا موقع تو ملا ہوگا۔جبلِ نور جس پر غارِحرا واقع ہے اتنا وسیع اور بلند ہے کہ اگر غار تک جانے کے لئے راستے کے نشان نہ لگے ہوں تو انسان گم ہو جائے لیکن میں صدقے جاؤں ان قدموں کے جو غارِ حرا تک جاتے ہوئے ایک ماہر کوہ پیما کے قدم بن جاتے تھے۔آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ اسی غارِحرا میں ''اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ'' کے مطابق جبرائیلؑ پہلی وحی لے کر رات کے وقت آئے تھے اور اسکے بعد کچھ دیر کے لئے وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ اس دوران نبی کریمؐ نہایت مضطرب رہتے تھے حالانکہ رات کے اندھیرے میں، گھر سے بہت دور، یکہ وتنہا ایک بندے کو اللہ کا ایک اور بندہ (انجان جبرائیلؑ) زور زور سے سینے سے بھینچ بھینچ کر کہے کہ ''پڑھ'' اور ایک دفعہ نہیں تین دفعہ کہے اور اتنی زور سے بھینچے کہ سانس لینا دشوار ہو جائے ،تو بندہ دوبارہ کبھی اس طرف کا رخ نہ کرے لیکن وحی کے الفاظ کی مقناطیسیت اور حقانیت نبی کریمؐ کو کھینچ کھینچ کر دوبارہ اسی مقام پر لے جاتی تھی۔

صحیح بخاری کی حدیث نمبر 4926 کے مطابق جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں ۔'' میں نے رسول اللہؐ کو کہتے ہوئے سنا اور وہ'' فترۃ الوحی'' (Pause in Wahee) کے متعلق بتا رہے تھے،'' جب میں پہاڑ پر چل رہا تھا تو میں نے آسمان سے آتی ہوئی ایک آواز سنی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان اور زمین کے درمیان (یعنی افق پر) ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ (وہ اتنے بڑے نظر آئے کہ) گویا وہ پورے افق پر چھائے ہوئے ہیں میں ان سے رعب میں آ گیا اور دہشت زدہ ہو کر گھر کو پلٹا اور گھر والوں سے کہا، زَمِّلُوۡنِیۡ زَمِّلُوۡنِیۡ مجھے موٹا سا کپڑا (کمبل) اڑھا دو۔گھر والوں نے مجھے موٹا کپڑا اڑھا دیا۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی ''یٰۤاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ اے مدثر! اٹھ کھڑا ہو! (ڈرنے ، کپڑا اوڑھ کر لیٹنے کا وقت نہیں ، کمر کس لے! تیرے سامنے بڑے بڑے کام ہیں معاشرے میں برائیاں کرنے اور پھیلانے والوں کو شرک کرنیوالوں کو ان کاموں کے انجام بد سے) ڈراؤ! اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو، (انہیں بتاؤ کہ تمہیں پیدا کرنے والا پالنے پوسنے والا بے شمار چیزیں تمہارے لیے مسخر کرنے والا تمہارا رب کتنا عظیم ہے۔اپنی باطنی صفائی کے ساتھ ساتھ) اپنے کپڑوں اور لباس کو بھی پاک صاف رکھیں اور بتوں کی گندگی کو چھوڑ دیں۔(تمہارے Elite ابو جہل ٹائپ کے لوگ چھوڑیں نہ چھوڑیں) اور (یہ اصول اپنا لیں کہ) کسی کے ساتھ اس امید پر اچھا سلوک نہ کریں کہ وہ آپ کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرے گا۔ وَلِرَبِّكَ فَاصۡبِرۡ (74:1-7) اللہ تعالیٰ کو تو پتہ تھا کہ جو میں محمدؐ کو کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں وہ ہے تو سراسر رحمت اور انسانوں کے ساتھ حسن سلوک، لیکن اس کے جواب میں کوئی انہیںؐ پھولوں کے ہار نہیں پہنائے گا۔اُنؐ کے لیے Red Carpet Welcome والا کوئی سین نہیں ہوگا۔ بلکہ گالیاں سننے کو ملیں گی، مار کٹائی ہوگی سوشل بائیکاٹ ہوگا۔قتل کی نہ صرف دھمکیاں ملیں گی بلکہ قتل کی بارہا کوششیں بھی کی جائینگی۔ویسے انسان کی عمومی عادت تو یہی ہوتی ہے کہ انسان حسن سلوک کے جواب میں حسن سلوک ہی کی توقع کرتا ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنا سنہرا اصول نبی کریمؐ کی وساطت سے انسانوں کو پہنچایا ہے کہ کسی سے توقعات نہ لگاؤ کیونکہ پوری نہ ہونے کے نتیجے میں جو مایوسی ہوتی ہے اس سے بچ جاؤ گے۔

یہ سارے اتنے بڑے بڑے کام کرنے کے لئے کمر کسنے پر آمادہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس لاڈ پیار والے نام اَلۡمُدَّثِّرُ سے آپؐ کو پکارا۔

شہید

ہم اردو بولنے والوں کو تو شہید کا یہی مطلب پتہ ہے کہ جو اللہ کی راہ میں مارا جائے وہ شہید ہے لیکن عربی میں شہید کا مطلب ہے گواہ (Witness) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ہم نے تمہیں امت وسط بنایا ہے۔تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسولؐ تمہارے قول پر گواہ بنیں'' (2:143)

صحیح بخاری کی حدیث نمبر 4487 میں ابو سعید خدری کہتے ہیں ۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: ''قیامت والے دن نوحؑ کو بلایا جائے گا۔ وہ کہیں گے ''اے رب میں حاضر ہوں'' اللہ تعالیٰ کہے گا، ''کیا تم نے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا؟'' نوحؑ کہیں گے ''جی ہاں'' پھر انکی امت سے کہا جائے گا، ''کیا تمہیں اس (نوحؑ) نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے، '' ہمارے پاس تو کوئی نذیر آیا Warner ہی نہیں! اللہ تعالیٰ کہے گا، ''نوحؑ! تمہارے لئے کون گواہی دے گا؟'' نوحؑ کہیں گے، ''محمدؐ اور انکی امت!'' پس وہ گواہی دیں گے کہ انہوں (نوحؑ) نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا تھا۔'' یہ ایک موقع ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو ''شہید'' کا نام دیا ہے۔

ایک دوسرا موقع بھی ہے جس میں نبی کریمؐ کو شہید نام دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا (4:41)

''کیا حال ہوگا اس دن جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور پھر آپؐ کو ان سب پر گواہ بنائیں گے؟''

اس آیت کی تفسیر میں صحیح بخاری کی حدیث نمبر 4582 ہے جس میں عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ''نبی کریمؐ نے مجھے کہا،'' مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ'' میں نے کہا،'' میں پڑھ کر سناؤں؟ حالانکہ قرآن تو آپؐ پر نازل ہوا ہے'' انہوںؐ نے فرمایا،'' مجھے دوسرں سے قرآن سننا اچھا لگتا ہے'' سو میں نے سورہ نساء پڑھنی شروع کی یہاں تک کہ میں اس آیت پر پہنچا،'' اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم تمہیں ان (تمہاری امت کے لوگوں) پر گواہ بنائیں گے؟'' (4:41) تو نبی کریمؐ نے فرمایا، بس کرو! (عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں میں نے بس کر دیا اور میں نے دیکھا کہ) نبی کریمؐ کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔'' ظاہر سی بات ہے اپنی امت پر شہید (گواہ) بننا اس بندہ خدا کے لئے کتنا گراں ہوگا جو ''امتی امتی'' کا فکر کرتے رہتے تھے۔ فرماتے تھے۔'' ہر پیغمبر کی ایک دعا ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ ضرور ہی قبول کرتا ہے لیکن میں نے اپنی یہ دعا قیامت والے دن اپنی امت کی شفاعت کے لئے بچا کے رکھی ہوئی ہے۔'' (بخاری 6304)

اور نبی کریمؐ کو اللہ تعالیٰ کے اس قول کی بھی خبر تھی کہ رسول کہے گا اے میرے رب! یقیناً میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔'' (25:30) دعا کریں اور کوشش کریں کہ ہم ان لوگوں میں سے نہ ہوں جن کے متعلق ہمارے رسولؐ کو یہ کہنا پڑے اور سوچیں یہ کہنا اس شہید' کے لئے کس قدر گراں ہوگا۔

شاہدٌ

اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو شاہد کا نام سورہ فتح کی آیت نمبر 8 میں دیا فرمایا، ''اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وارسلنٰک للناس رسولا 4:79 وما محمدٌ اِلَّا رسول 3:144 مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ 33:40

☆......☆......☆

عصمت اسامہ حامدی

باہمی تعلقات

بہت سے کٹھن کام، اتفاق واتحاد کی قوت سے آسان ہو جاتے ہیں اور بہت سے آسان کام نا اتفاقی اور باہمی پھوٹ سے کھٹائی میں پڑے رہتے ہیں۔ اگر ایک عمارت کی تعمیر کا اور اُٹھان مضبوط اور پائیدار بنیادوں پر اٹھائی ہو تو اس کا تعمیر سامان اور مصالحہ معیاری اور پائیدار ہونا ضروری ہے ورنہ اینٹیں باہم جڑ نہ پائیں گی اور کچھ عرصہ بعد ہی عمارت ٹوٹنے لگے گی موجودہ دور نفسانفسی، مادہ پرستی اور اخلاقی اقدار کے زوال کا دور ہے۔ انسان ایسے میں بعض اوقات خود کو تنہا محسوس کرتا ہے کیونکہ کوئی کسی کا دکھ سکھ سننے والا نہیں بلکہ پیسے کمانے کی دوڑ اور معیار زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے کی خواہشات نے لوگوں کو خود غرض بنا دیا ہے۔ کسی کے پاس دوسرے کے مسائل کو حل کرنے کا وقت نہیں ہے۔ بلکہ ہر کوئی دوسرے کو دھکا دے کر گرانے اور خود سبقت لے جانے میں کوشاں نظر آتا ہے (الا ماشآء اللہ)۔

ان حالات میں جو لوگ کسی مقصد اور نصب العین کو لے کر کسی بڑے کام کے لئے مصروف عمل ہوں انہیں ایک دوسرے کا دست و بازو بننا چاہئے، حوصلہ افزائی اخلاقی و اصولی حمایت کرنی چاہئے۔ مشکل وقت میں کام آنا چاہئے۔ رسول اللہؐ کی سنت کی پیروی میں مواخات قائم کرنی چاہئے تاکہ وہ ایک قوت بن سکیں اور باطل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔ لیکن یہ مقام اپنی انا کی قربانی دیئے بغیر حاصل ہونا مشکل ہے۔ فرد کو اپنی صلاحیتوں کا ادراک ہونا چاہئے اور اُسے اجتماعیت کے فائدے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنا چاہئے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''محمدؐ، اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت ہیں اور آپس میں رحیم ہیں۔'' (سورۂ فتح آیت 29)

یہ عہد نبویؐ کی اخوت و بھائی چارہ ہی تھا جس نے مسلم معاشرہ یوں تشکیل دیا کہ اہل ایمان ایک جسم کی مانند کام کرتے دکھائی دیتے تھے۔ باہم مربوط، یک جان اور ہم آہنگ۔ اس کے ساتھ ساتھ نبی کریمؐ کی شفیق و مہربان شخصیت جن کی محفل میں ہر فرد یہی محسوس کرتا تھا کہ ان کے امیر رسول اللہؐ کو سب سے زیادہ محبت اسی سے ہے۔ آپؐ کی اس خوبی کو ایک لیڈر کی نمایاں صفت ہونا چاہئے کہ اُس کا رویہ، اخلاق، توجہ اور برتاؤ سب ساتھیوں کے ساتھ یکساں ہونا چاہئے، مساوات ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی تعریف بیان فرمائی:

''پس اللہ کی رحمت کی وجہ سے آپؐ ان کے لئے نرم خو واقع ہوئے ہیں اور اگر آپؐ تند خو سخت دل ہوتے تو یہ آپؐ کے اردگرد سے چھٹ جاتے۔ (آل عمران 159)

خود رسول اللہؐ کا فرمان ہے:

''جو نرمی سے محروم کیا گیا، وہ خیر سے محروم کیا گیا۔'' (مسلم)

نبی اکرمؐ کا معاشرہ، ظہور اسلام سے قبل جس جاہلانہ حالت میں تھا، وہ رسول اللہؐ کے اخلاق و کردار، نرمی و دل سوزی اور مسلسل اصلاحی کوشش سے بالکل بدل گیا۔ حتیٰ کہ وہی اُجڈ، جنگجو اور جاہل لوگ اپنے وقت کے بہترین تہذیب یافتہ، تعلیم یافتہ اور باکردار لوگ کہلائے۔

ے عرب جس پر قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اُس کی کایا!
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا!

باہمی اختلافات کی صورت میں:

ارشاد الٰہی ہے '' اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو انکے درمیان صلح کرادو۔'' (الحجرا9)

حضور اکرمؐ کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ اس وقت

تک کسی جھگڑے کا فیصلہ نہ کرنا جب تک دوسرے فریق کا موقف بھی اسی طرح نہ سن لو جس طرح تم نے پہلے فریق کا سنا تھا۔(ابوداؤد کتاب القضا)

سیدنا ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے فرمایا: میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں اور بعض اوقات جب تم باہمی جھگڑا لاتے ہو تو ممکن ہے کہ تم میں سے بعض اپنے فریق مخالف کے مقابلے میں اپنا مقدمہ پیش کرنے میں زیادہ چالاکی سے بولنے والے ہوں اور اس طرح میں اس کے مطابق فیصلہ کر دوں جو میں تم سے سنتا ہوں۔ پس میں جس شخص کے لئے بھی اس کے بھائی کے حق میں سے کسی چیز کا فیصلہ کروں تو وہ اسے نہ لے کیونکہ اس طرح میں اسے جہنم کا ایک ٹکڑا دیتا ہوں۔'' (بخاری)

حضور اکرمؐ نے فرمایا: میں اُس شخص کے لئے جنت کے اطراف میں ایک گھر کا ضامن ہوں جس نے حق پر ہوتے ہوئے بھی جھگڑا چھوڑ دیا اور اس شخص کے لئے جنت کے درمیان میں ایک گھر کا ضامن ہوں جس نے مزاح کے طور پر بھی جھوٹ کا ارتکاب نہیں کیا۔ اور اس شخص کے لئے جنت کے بلند ترین حصے میں گھر کا ضامن ہوں جس نے اپنا اخلاق اچھا کر لیا۔(ابوداؤد)

سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا جس نے اپنے کسی بھائی پر ظلم کیا ہو اسے چاہیے کہ اس سے (دنیا میں) معاف کروالے کیونکہ وہاں درہم و دینار نہ ہونگے۔ پہلے اسکے بھائی کے لئے اس کی نیکیوں میں سے حق دلایا جائے گا اور اگر اسکے پاس نیکیاں نہ ہونگی تو اسکے بھائی (مظلوم) کی برائیاں اس پر ڈال دی جائیں گی۔(بخاری)

تعلقات میں بگاڑ کی وجوہات

فرمایا: آدمی کے لئے اتنی برائی ہی کافی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے، ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا سب کچھ حرام ہے، اسکا خون بھی اور اسکا مال بھی اور اس کی عزت بھی۔'' (مسلم)

باہمی تعلقات کی اصلاح کیلئے فرمایا:

''تم بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے اور کسی کی بات پر کان نہ لگاؤ اور ٹوہ میں نہ رہا کرو اور ایک دوسرے کے مقابلے میں حرص نہ کرو اور ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو اور ایک دوسرے کی طرف پیٹھ نہ پھیرو اور اللہ کے بندو آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔'' (مسلم)

سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ سے عرض کیا گیا! '' اے اللہ کے رسولؐ، فلاں عورت رات کو قیام کرتی ہے اور دن کو روزہ رکھتی ہے اور عمل بھی کرتی ہے اور صدقہ بھی کرتی ہے اور اپنے پڑوسی کو اپنی زبان سے اذیت دیتی ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: اس عورت میں کوئی خیر نہیں وہ آگ والوں میں سے ہے۔ لوگوں نے کہا: اور فلاں عورت (صرف) فرض نماز پڑھتی ہے اور معمولی صدقہ بھی کرتی ہے اور کسی کو اذیت نہیں دیتی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: وہ جنت والوں میں سے ہے۔'' (بخاری)

ان احادیث کی روشنی میں دوسروں کو حقیر سمجھنا، جلد بدگمان ہو جانا، تجسس کرنا، ذاتی معاملات کی ٹوہ لگانا، حرص، حسد، بغض اور زبان درازی، تعلقات میں بگاڑ کی بڑی وجوہات ہیں۔

اللہ کے راستے میں نکل کر متحد اور اکٹھا رہنا

حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ فرماتے ہیں کہ لوگ جب کسی منزل پر پڑاؤ ڈالا کرتے تھے تو بکھر جایا کرتے تھے اور گھاٹیوں اور وادیوں میں پھیل جایا کرتے تھے حضورؐ نے فرمایا: تمہارا یہ گھاٹیوں اور وادیوں میں بکھر جانا شیطان کی طرف سے ہے۔ اس فرمان کے بعد مسلمان جہاں بھی ٹھہرتے تھے، اکٹھے ہو کر مل جل کر رہتے۔'' (ابوداؤد، انسائی، بحوالہ حیاۃ الصحابہؓ)

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں!

حضرت معاذ جہنیؓ فرماتے ہیں کہ میں حضورؐ کے ساتھ فلاں غزوہ میں گیا۔ (ایک جگہ ہم نے پڑاؤ ڈالا، لوگ بکھر گئے جس سے) لوگوں کیلئے ٹھہرنے کی جگہ تنگ پڑ گئی اور راستے بند ہو گئے، اس پر حضورؐ نے ایک منادی کو بھیجا جو لوگوں میں یہ اعلان کر دے کہ جس نے ٹھہرنے کی جگہ تنگ کی یا راستہ بند کیا، اُس کا کوئی جہاد نہیں، یعنی اسے جہاد کا ثواب نہیں ملے گا۔'' (بیہقی)

دوسروں کے اچھے اعمال کی گواہی دینا

حضورؐ ایک مرتبہ تشریف فرما تھے۔ آپ کو لوگوں نے بتایا کہ ایک آدمی کا انتقال ہو گیا ہے۔ حضورؐ نے پوچھا، کیا تم میں سے کسی نے اسکو

خیر کا عمل کرتے ہوئے دیکھا ہے؟

ایک آدمی نے کہا، جی ہاں۔ایک رات اُس کے ساتھ اللہ کی راہ میں، میں نے پہرہ دیا ہے۔اس پر حضورؐ نے اور آپؐ کے ساتھیوں نے کھڑے ہوکر اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ جب اسے قبر میں رکھ دیا گیا تو حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے اس پر مٹی ڈالی۔ پھر فرمایا: تمہارے ساتھی تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ تم دوزخ والوں میں سے ہو اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم جنت والوں میں سے ہو۔ پھر حضورؐ نے حضرت عمر بن خطابؓ سے فرمایا: ''تم لوگوں کے برے اعمال کے بارے میں نہ پوچھا کرو بلکہ تم فطرت (والے اسلامی اعمال) کے بارے میں پوچھا کرو۔'' (طبرانی)

ایک اور مقام پر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''جو آنکھ اللہ کے راستہ پر پہرہ دے اُس آنکھ پر آگ (جہنم) حرام کردی گئی ہے۔'' (احمد، نسائی، طبرانی، بیہقی)

اسی طرح ہدایتِ نبوی ہے:

''جب تم کسی آدمی کو مسجدوں میں پابندی سے نماز باجماعت پڑھتے ہوئے دیکھو تو اسکے مومن ہونے کی گواہی دو۔'' (ترمذی۔ابن ماجہ)

اصلاحِ احوال

رسول اللہؐ نے انسانوں کی بتدریج اس طرح تربیت کی جیسے کوئی والد صبر وتحمل سے اپنے بچوں کو تعلیم دیتا ہے، اُن کی خطاؤں اور غلطیوں کی اصلاح بھی کرتا ہے اور درگذر بھی کرتا ہے، بعض تعلقات خطائیں نظر انداز بھی کرنا پڑتی ہیں۔

آپؐ کا ارشادِ گرامی ہے:

''اگر تُو لوگوں کے عیوب کے پیچھے پڑ گیا تو تُو انہیں بگاڑ دیگا یا قریب ہے کہ تُو انہیں بگاڑ دے۔'' (ابوداؤد)

رب العالمین کا فرمان ہے:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی پیدا کرو تو کشادگی کردیا کرو۔'' (المجادلہ:11) (اسی طرح دلوں میں بھی کشادگی ضروری ہے)۔

اگر غلطی سے کسی مومن کی غیبت یا برائی منہ سے نکل جائے تو اسکے لئے یہ دعا حضور اکرمؐ نے سکھائی ہے: ''اے اللہ! میں نے جس مومن کو برا بھلا کہا ہو تو اس کے لئے قیامت کے دن اپنی قربت کا ذریعہ بنادے۔'' (بخاری)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مہربانؐ کو حکم دیا'' **واخفض جناحک للمومنین**''

''اپنے بازو مومنین کیلئے جھکا دیجئے ......'' مومنین کے لئے بازو جھکانے کا حکم کس کو دیا جارہا ہے، سرورانبیاؐ کو! ان مومنین میں بڑے اور چھوٹے کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

اور نبی اکرمؐ نے مسلمانوں کو کیا نصیحت فرمائی جس سے اس کی اخوت ومحبت میں اضافہ ہوجائے ......فرمایا:'' جب تم میں سے کسی کو اپنے بھائی سے محبت ہو تو اسے اس بات کی خبر کردے (کہ مجھے تم سے محبت ہے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دوسرے مسلمان کے دل میں بھی اس کے لئے محبت پیدا ہوجائے گی)۔(ترمذی)

حضرت انسؓ سے روایت ہے، ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ تین دن مسلسل یہ ہوتا رہا کہ رسول اللہؐ اپنی مجلس میں فرماتے کہ اب تمہارے سامنے ایک ایسا شخص آنے والا ہے جو اہل جنت میں سے ہے اور ہر بار وہ آنے والے شخص انصار میں سے ایک صاحب ہی ہوتے۔ یہ دیکھ کر حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن عاص کو جستجو پیدا ہوئی کہ آخر یہ کیا عمل ایسا کرتے ہیں جس کی بنا پر حضورؐ نے ان کے بارے میں بار بار یہ بشارت سنائی ہے چنانچہ وہ ایک بہانہ کر کے تین روز مسلسل ان کے ہاں جا کر راتیں گزارتے رہے تا کہ ان کی عبادت کا حال دیکھیں مگر ان کی شب گزاری میں کوئی غیر معمولی چیز انہیں نظر نہ آئی۔ ناچار انہوں نے خود انہی سے پوچھ لیا کہ بھائی آپ کیا عمل ایسا کرتے ہیں جس کی بنا پر ہم نے حضورؐ سے آپؓ کے بارے میں یہ عظیم بشارت سنی ہے۔انہوں نے کہا کہ میری عبادت کا حال تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ البتہ ایک بات ہے جو شاید اس (بشارت) کا موجب بنی ہو اور وہ یہ ہے کہ میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے خلاف کپٹ (بغض) نہیں رکھتا اور نہ کسی ایسی بھلائی پر جو اللہ نے اُسے عطا کی ہو، اس سے حسد کرتا ہوں۔'' (نسائی) ☆

پروفیسر محمد اکرام طاہر

رحمۃ للعالمین ﷺ کا معاشی اسوۂ حسنہ

سیدنا حضرت یوسفؑ کو اللہ تعالیٰ نے تعبیر خواب کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا۔ سورۃ یوسف میں ان خوابوں کا ذکر موجود ہے جن کی آپ نے صحیح صحیح تعبیر بتا دی تھی۔ ان میں وہ بھیانک خواب بھی شامل تھا جو شاہِ مصر نے ان دنوں دیکھا جب زنانِ مصر کی سازشوں کی وجہ سے صریحاً ناانصافی کرتے ہوئے ان کو حوالۂ زنداں کر دیا گیا تھا۔

یوسفؑ نے اس موقع پر تعبیر خواب بتا دینے کو کافی نہیں سمجھا بلکہ رحیمانہ اور خیر خواہانہ مشورہ بھی دیا کہ پیداوار کے تمام گیہوں کو خوشوں کے اندر رہنے دیں اور بقدرِ ضرورت صاف کر کے غلہ نکالیں تا کہ آخر سالوں تک خراب نہ ہو جائے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نبوت اور معیشت باہم متغائر و متصادم نہیں ہیں۔ تمام انبیا کرام للّٰہیت، عبودیت اور تقویٰ و احسان کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔ اپنے عمل اور اسوہ سے انہوں نے دنیا کو یہ سبق دیا کہ نیک آدمی وہ نہیں جو کشاکش زندگی سے کنارہ کش ہو کر ویرانوں اور صحراؤں میں اللہ کو تلاش کرتا پھرے اصل نیک شخص وہ ہے جو زندگی کے بنیادی امور اور روزمرہ سرگرمیوں میں نہ صرف بھرپور دلچسپی لیتا ہے بلکہ حکیمانہ رہنمائی بھی پیش کرتا ہے۔

حضرت یوسفؑ ہی نہیں، جتنے انبیائے کرام مبعوث ہوئے، سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے معاشی امور میں دخیل رہتے تھے۔ حضرت نوحؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں متوقع طوفان سے اہل ایمان کو بچانے کے لئے تیس گز اونچی تین منزلہ کشتی بنائی تھی۔ گویا حضرت نوحؑ بڑھئی کے کام میں خوب ماہر تھے۔ حضرت داؤدؑ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے لوہے کو نرم کر دیا تھا اور وہ زرہیں فروخت کر کے روزی کماتے تھے۔ حضرت ادریسؑ درزی کا کام کرتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کاشت کاری کرتے تھے۔ قبل از نبوت حضور رسالت مآبؐ بچپن میں بکریاں چرایا کرتے اور جوانی میں ایک معاہدہ کے مطابق سیدہ خدیجہؓ کے لیے تجارتی سفر بھی کیا کرتے تھے۔ آپؐ کے زمانۂ تجارت کو یاد کرتے ہوئے قیس بن سائب مخزومی فرماتے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں رسول اللہؐ میرے شریک تجارت تھے۔ آپؐ بہترین شریک تھے۔ نہ جھگڑتے تھے اور نہ کسی قسم کا مناقشہ کرتے تھے۔ بکریاں چرانے کے بارے میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت میں ہے کہ ہم مقام الظہر ان میں رسول اللہؐ کے ساتھ تھے۔ ہمیں وہاں پیلو کے پھل چنتے دیکھ کر آپؐ نے فرمایا، سیاہ دیکھ کر چنو۔ وہ زیادہ خوش ذائقہ اور لذیذ ہوتے ہیں۔ ہم نے پوچھا۔ یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ بکریاں چراتے تھے (جو آپ ﷺ کو یہ بات معلوم ہوئی)؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔''

انبیائے کرام کے ان معمولات میں ایک حکمت یہ پوشیدہ ہے کہ روزی کمانے کے لئے مذکورہ معاشی سرگرمیاں کسی انسان کے لئے باعث ننگ و عار نہ ہونی چاہئیں۔ اصل اہمیت رزق حلال اور کسب حلال کو حاصل ہے اور یہ کہ معاشی جدوجہد اخلاقی و روحانی ترقی کے راستے میں حائل نہیں ہوسکتی۔ انبیائے کرام کے اپنے عمل سے یہ بھی ثابت ہے کہ طلب و رسد کے قوانین، بیع وشرا کے اصول وضوابط، مستاجر اور آجر کے تعلقات اور منڈی کی معیشت کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں بھی وہ براہ راست علم اور تجربہ رکھتے تھے۔

قرآن مجید میں رزقِ حلال کے لئے معاشی جدوجہد کی زبردست حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور رزق حلال کی کوشش کو اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرنے کا نام دیا گیا ہے۔

''پھر جب نماز (جمعہ) پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔'' (الجمعہ۔10)

حج ایک انتہائی اہم روحانی عبادت ہے۔قران حکیم نے اس معاملے میں بھی روحانیت اور مادیت کو باہم ملا دیا ہے۔قبل از اسلام لوگ حج کے لئے جاتے وقت زادِراہ لینے کو شانِ تقویٰ کے خلاف سمجھتے اور پھر ضرورت کے وقت دوسرے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے۔قرآن حکیم میں اس راہبانہ تصور پر بھی ضرب کاری لگائی گئی۔

''اور (حج کے سفر میں) زادِراہ ساتھ لے جایا کرو، کیونکہ بہترین زادِراہ تقویٰ ہے۔'' (البقرہ:۱۹۷)

بعض حضرات حج کے سفر میں تجارت کو بھی روحانیت کے منافی جانتے تھے۔قرآن حکیم میں یہ غلط فہمی بھی دور کر دی گئی، بشرطیکہ حج کے مناسک متاثر نہ ہوں۔

''تم پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں کہ تم (حج کے دوران تجارت یا مزدوری کے ذریعے) اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو۔'' (البقرہ۔198)

حالت احرام میں دوسری بہت سی پابندیوں کے ساتھ ہر نوع کے شکار پر بھی پابندی ہے، البتہ احرام اُتار دینے کے بعد حکم ہے:

''ہاں احرام کی حالت جب ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو۔'' (المائدہ:۲)

الغرض زمین میں انسان کے لئے ذرائع معاش کا پیدا کیا جانا اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے ہے۔اس کا بنیادی تقاضا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے لئے شکر گزاری کا رویہ اختیار کرے۔

''ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لئے یہاں سامان زیست فراہم کیا، مگر تم کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔'' (الاعراف۔10)

ایک دوسرے مقام پر اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے۔

''یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن بنائے، تا کہ تم (رات میں) سکون تلاش کرو اور (دن کو) اپنے رب کا فضل تلاش کرو، شاید کہ تم شکر گزار رہو۔'' (القصص۔73)

معاشی سرگرمیوں کی اہمیت کو ایک امر واقعہ کے طور پر بیان کرنے کے بعد صیغۂ امر و نہی کو استعمال کرتے ہوئے اپنے جائز مال کو اخروی فائدے کے لئے استعمال کرنے اور دنیاوی آرام و راحت کے لئے اپنا جائز حصہ ترک نہ کرنے کی بھی تلقین کر دی گئی۔ارشاد ربانی ہے:

''جو مال اللہ تعالیٰ نے تجھے دیا ہے، اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔'' (القصص۔77)

معاشی پہلو کی اس اہمیت کے باوجود اس غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں کہ اسلام کے نزدیک معیشت ہی زندگی کا مطلوب و مقصود ہے۔حقیقت یہ ہے کہ توازن و اعتدال اسلامی تعلیمات کی امتیازی شان ہے۔جس طرح رہبانیت کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، ایسے ہی مادی خوشحالی بھی مقصود بالذات نہیں ہے۔مطالعۂ قرآن سے پتا چلتا ہے کہ خدا فراموش اقوام بے تحاشا مادی ترقی کے باوجود صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئیں۔قرآن حکیم میں متعلقہ آیات اس باب میں اس قدر واضح ہیں کہ کسی قسم کے اشتباہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔صرف تین مقامات ملاحظہ ہوں۔

''کتنی بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جو اپنی معیشت پر اترائیں، اب دیکھ لو اُن گھروں کو، کم ہی کوئی ان کے بعد ان گھروں میں بسا ہے اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔'' (القصص۔58)

''کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔کتنے ہی عیش کے سروسامان جن میں مزے کر رہے تھے، اُن کے پیچھے دھرے رہ گئے۔یہ ہوا ان کا انجام اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین اور ذرا سی بھی مہلت ان کو نہ دی گئی۔'' (الدخان۔29,25)

''پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی، بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان پر کھول دیئے، یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں، جو انہیں عطا کی گئی تھیں، خوب مگن ہو گئے، تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب یہ حال تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کے رکھ دی گئی، جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے رب العالمین کے لئے۔'' (الانعام۔44،45)

قرآن پاک میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ جس نصیحت کو

فراموش کر دینے کی پاداش میں مذکورہ قوموں کو نیست و نابود کر دیا گیا، وہ نصیحت دراصل کیا تھی؟ قرآن کے اولین مخاطبین اور بعد میں آنے والی قوموں کو واضح کر دیا گیا کہ تباہ شدہ اقوام نے کتاب اللہ کے احکام و حدود کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اگر وہ لوگ احکامِ الٰہی سے بغاوت نہ کرتے تو ان پر ایسی معاشی برکات کا نزول ہوتا جو انکے وہم و گمان سے بھی ماوراء تھیں۔

'' کاش انہوں نے تورات اور انجیل اور دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو ان کے لئے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا۔'' (المائدہ۔66)

دنیا کے تمام خدا بیزار معاشروں میں یہ قدر مشترک رہی ہے کہ وہ پیدائش دولت اور افزائش دولت کو محض اپنی ذہانت و فطانت کا کرشمہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے صرف دولت کی ہر شکل کو بھی صرف اپنا ہی استحقاق گردانتے ہیں۔ انبیا کرام چونکہ اس طرز فکر اور طرز معیشت و معاشرت کے سب سے بڑے ناقد ہوتے ہیں، اس لئے مفاد پرست طبقات (Vested Interests) آگے بڑھ کر ان کے خلاف مورچہ زن ہو جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں دولت کے بہت بڑے پجاری کا قول بایں الفاظ نقل کیا گیا ہے۔

'' قارون نے کہا، یہ سب مال و دولت مجھے اپنی ہنر مندی سے ملا۔'' (اس لیے میں اس کا حقیقی مالک ہوں اور مجھے اس پر ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہے) حضرت شعیبؑ کی قوم نے دعوتِ توحید کے جواب میں جو کچھ کہا وہ دنیا بھر کے مترفین اور ان کی روایتی مذہبیت کی لفظ بہ لفظ عکاسی کرتا ہے۔

'' اے شعیب کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں، یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں۔'' (ہود۔87)

عربوں کے معاشی حالات قبل از اسلام

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قدیم عرب نیم وحشی قبائل تھے اور بقیہ دنیا سے کٹے ہوئے تھے۔ یہ بات مکمل طور پر درست نہیں۔ عملاً یہ ایسا علاقہ تھا جس کی سرحدوں کے آس پاس عالمی طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھیں اور اس عالمی کشمکش میں عرب قبائل اپنے معاشی مفادات کے تحفظ و فروغ کی مختلف صورتیں نکالنا جانتے تھے۔ یہاں تجارت اور بینک کاری کا نظام بھی موجود تھا۔ زمانہ قدیم میں جنوبی عرب کے معاشرہ کی بنیاد زراعت پر تھی۔ غلہ کے علاوہ طرح طرح کے مصالحوں، لوبان اور عطریات کو بھی اس علاقہ کی مشہور پیداوار سمجھا جاتا تھا۔ مصالحے اور عطریات وغیرہ تو ان کی مشہور برآمدات میں شمار ہوتی تھیں۔ چنانچہ بیرون عرب خطۂ عرب کی ایک وجۂ شہرت یہاں کے مصالحے اور عطریات بھی رہے ہیں۔ ہر سال عرب کے مختلف علاقوں میں تجارتی میلے لگا کرتے تھے۔ سب سے مشہور میلہ مکہ کے قرب و جوار میں عکاظ کے مقام پر لگتا تھا۔ مکہ کئی لحاظ سے عربوں کا تجارتی ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس کے مرکز ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ یمن، شام اور شمال کی طرف جانے والے راستے پر واقع تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ قریش دنیا کے اولین بین الاقوامی تاجروں میں سے تھے۔

بعثتِ نبویؐ سے قبل کفار مکہ کم و بیش ہر اس معاشی برائی میں مبتلا تھے جو اسلام کے نظام عدل و مواسات کی عین ضد سمجھی جاتی ہے۔ ذخیرہ اندوزی، سود، قمار وغیرہ کو وہ لوگ تجارتی معمولات کا درجہ دیتے تھے۔ محروم و مجبور طبقات کے استحصال کی جو مختلف شکلیں ان کے ہاں رائج تھیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کے سرمایہ داروں کی طرح وہ ''بکارِ خویش'' خوب ہوشیار تھے۔ مکے کے سٹہ باز تجارتی قافلوں کی آمد اور روانگی کے بارے میں شرطیں لگا کر بھی رقم کمانے کا ہنر جانتے تھے۔ یہ لوگ دودھ دینے والے جانوروں کو فروخت کرنے سے دو تین دن پہلے ان کے تھن باندھ دیتے، تا کہ وقت فروخت وہ زیادہ دودھ دیں۔ تاجر حضرات کھیتوں کی ممکنہ پیداوار قبل از وقت خرید کر قبضہ کر لیتے اور بعد ازاں من مانی قیمت پر فروخت کر دیتے۔ یہ لوگ اکتناز اور احتکار (Hoarding) کے ذریعے اشیائے خوردنی کی مصنوعی قلت پیدا کر کے ناجائز انتفاع کی صورت نکالنے میں بھی خوب ماہر تھے۔ موجودہ زمانے کی سٹہ بازی (Speculation) کا بھی ان کے ہاں رواج تھا۔ اس کے

مطابق مال اور قیمت کے عدم وجود کے باوجود سودے طے پا جاتے اور پھر کسی ایک فریق کے مکمل نفع اور دوسرے فریق کے مکمل خسارے پر منتج ہوتے۔ غلامی کے ادارے کی بدترین شکل کی موجودگی سے پتا چلتا ہے کہ بیگار کا رواج عام تھا۔ کعبہ کی تولیت بھی قریش کی تجارتی اجارہ داری میں معاون تھی۔ ان کے تجارتی قافلے قبائلی کی لوٹ مار سے محفوظ رہتے۔ وہ سب کچھ برداشت کر لیتے، مگر اپنے تجارتی مفادات پر زد پڑنے کی متحمل نہ ہوتے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کے قبول اسلام کے بعد وہ اُن کے درپے آزار ہوئے، مگر جب احساس ہوا کہ ان کا قبیلہ مکہ کے تجارتی کاروانوں کے لئے راستے میں مزاحم ہوسکتا ہے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ (صحیح بخاری، جلد 1) اسی طرح حضرت سعد بن معاذؓ کو بھی انہوں نے طواف کعبہ سے روکنا چاہا، مگر جب انہوں نے مدینہ کے قریب سے گزرنے والے قریشی قافلوں کو روکنے کی بات کی تو ان کے ہوش ٹھکانے آگئے اور وہ خون کے گھونٹ پی کے رہ گئے۔ (صحیح بخاری جلد۲)

عربی معاشرہ نیک لوگوں سے یکسر خالی نہ تھا۔ ظلم وجور اور فسق و فجور کے اس یبوست زدہ ماحول میں بھی ''حنفا'' کے نام سے کچھ لوگ موجود تھے۔ یہ لوگ دین ابراہیمی کے پیروکار ہونے کے مدعی تھے۔ ذاتی طور پر یہ حضرات انفرادی اصلاح کے لئے کوشاں تھے۔ تاہم اس بات کے شواہد نہیں ملتے کہ انہیں کبھی سنجیدگی سے لیا گیا ہو یا انفرادی سطح پر کیے گئے چند صالح اعمال سے مروجہ نظام Status quo کے لیے کوئی حقیقی خطرہ لاحق ہوا ہو۔ یہی صورت ہمیں مدنی معاشرے میں بھی نظر آتی ہے۔ اہل مدینہ زیادہ تر زراعت پیشہ تھے۔ وہاں اہل کتاب یہود سے توقع کی جاسکتی تھی کہ حرام وحلال میں تمیز کریں گے لیکن وہ بحیثیت مجموعی خود سود کی لعنت میں مبتلا تھے۔ ان کے مذہبی رہنما بھی ان حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر چکے تھے۔ قدرتی طور پر وہ اس ظالمانہ معاشی نظام کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کر سکتے تھے جس کے ساتھ ان کے دیرپا معاشی مفادات وابستہ ہو چکے تھے۔ ان کے اس طرز فکر وعمل کو قرآن پاک میں یوں بیان کیا گیا:

''کیوں ان کے علما اور مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے؟ یقیناً بہت ہی برا کارنامۂ زندگی ہے جو وہ تیار کررہے ہیں۔'' (المائدہ۔63)

بعثت نبویؐ کے بعد

بعثت نبویؐ کے بعد مکی سورتوں میں ایک ایک کر کے ان تمام معاشی ناانصافیوں کی پرزور مذمت کی گئی جو اہل ثروت کے کلچر کا حصہ بن چکی تھیں۔ یہ لوگ ناپ تول میں بے ایمانی کرتے تھے۔ فرمایا گیا:

''تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔'' (المطففین۔ا تا3)

ہر جائز وناجائز ذریعے سے مال سمیٹنا اور جمع کیے رکھنا بہت سے لوگوں کے لئے واحد ذریعہ عزت وعظمت تھا۔ ایسے لوگوں کو وعید سنائی گئی:

''بڑی خرابی ہے ہر اس شخص کے لئے جو عیب چین اور بدگو ہے جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس ہمیشہ رہے گا۔ ہرگز نہیں وہ پھینکا جائے گا۔ توڑ دینے والی آگ میں۔'' (الھمزہ۔ا تا4) اپنی دنیا بنانے کی دھن میں یہ لوگ اس حد تک مگن تھے کہ محرومین کے حقوق کی ادائیگی ان کے ایجنڈے سے ہی خارج ہوگئی۔ اس قارونی ذہنیت کی مذمت کے لئے قرآن میں ''التکاثر'' کی اصطلاح استعمال کی گئی:

''تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ اسی فکر میں تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو۔'' (التکاثر۔1،2)

ایسے لوگوں کی بھی نشاندہی کردی گئی جو روز جزا کے منکرین یا پورے دین کی تکذیب کرتے ہیں۔

''پس یہی وہ بدبخت ہے جو دھکے دے کر نکالتا ہے یتیم کو اور دوسروں کو ترغیب نہیں دیتا کہ غریب کو کھانا کھلائیں۔'' (الماعون۔2،3)

قرآن پاک میں اہل جنت اور اہل دوزخ کے درمیان ہونے والی ایک مختصر گفتگو کی جھلک بھی دکھائی گئی ہے۔ اہل جنت، اہل دوزخ سے سوال کریں گے کہ کس چیز نے تمہیں دوزخ میں داخل کیا؟

''وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے اور مسکین کو کھانا بھی نہیں کھلایا کرتے تھے۔'' (المدثر۔43،44)

وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور رضا کے مابین فرق سمجھنے سے قاصر تھے۔ اپنے مجرمانہ ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے انہوں نے تقدیر کا بھی ایک خودساختہ اور گمراہ کن تصور گھڑ لیا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ غریب وامیر کی تقسیم اللہ کی مرضی سے ہے اور کوئی دوسری قوت اس ''فطری'' نظام میں خلل کیوں ڈالے۔

''جب انہیں کہا جاتا ہے کہ خرچ کرو اس مال سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے۔ تو کفار ایمان والوں سے کہتے ہیں: کیا ہم انہیں کھلائیں جنہیں اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو خود کھلا دیتا۔ (اس طرح سوچنے اور کہنے والوں) تم بالکل بہک گئے ہو۔'' (یٰسین۔47)

حضور اکرمؐ کی ولادت باسعادت دنیا بھر میں ایک بالکل نئے اور بنیادی انقلاب کی نوید جانفزا تھی۔ چند سال کے لیے دریتیمؐ کو اپنے ساتھ لے جانے کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ اور ان کے خاندان کے دن پھر گئے۔ خشک سالی کی وجہ سے جن بکریوں کا دودھ تک خشک ہو گیا۔ تھا، وہ اب سب افراد خانہ کے لئے کفیل ہو گئیں۔ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کرتے ہوئے حضورؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ راستے میں عارضی قیام کے لئے اُمِ معبد نامی خاتون کے ہاں ٹھہرے تھے۔ آپؐ کے مبارک قدموں کی برکت سے اُمِ معبد کی کمزور اور بیمار بکری نے خلاف توقع اتنا وافر دودھ دیا کہ سب نے سیر ہو کر پیا۔ اہل نظر کے لئے یہ بامعنی اشارے تھے کہ آنے والے دور میں آپؐ کے ہاتھوں ایک عظیم معاشی انقلاب کا سورج طلوع ہوگا۔ ایک ایسا انقلاب جو غریب وامیر، حاکم ومحکوم، اور مزدور و مالک سب کے لئے عدل وانصاف کا ضامن ہوگا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ معروف معنوں میں مذہبی زندگی کے جو مظاہر اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ خاص سمجھے جاتے ہیں، اسلام میں وہاں بھی بندگان خدا کی معاشی بہبود واصلاح کی جابجا صورتیں نظر آتیں ہیں۔

انفاقِ سبیل اللہ کے غیر معمولی اجر کا تعلق محض اُخروی زندگی کے ساتھ نہیں ہے۔ اس دنیا میں بھی ایسے لوگوں پر اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے اور ان کے رزق میں برکت دی جاتی ہے۔ صحیح مسلم میں موجود ایک روایت کا خلاصہ اس حقیقت کا بین ثبوت ہے۔ ایک مسافر ایک لق ودق صحرا سے گزر رہا تھا۔ اچانک ایک مخصوص جگہ پر مطلع ابر آلود ہوا۔ دور ایک پہاڑی پر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارش کا پانی پہاڑی سے بہتا ہوا ایک نالے میں شامل ہو گیا۔ مسافر تحیر کے عالم میں نالے کے بہاؤ کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص اس نالے سے اپنے کھیت کو سیراب کیے جا رہا ہے۔ مسافر نے بوڑھے کسان سے اس رحمت خصوصی کا سبب دریافت کیا۔ کسان نے بتایا میں اپنی فصل کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ ایک حصہ اپنے اہل وعیال کی ضروریات پر خرچ کرتا ہوں۔ دوسرے حصے سے نئی فصل کے لیے بیج وغیرہ کا بندوبست کرتا ہوں اور تیسرا حصہ اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیتا ہوں۔

واضح رہے کہ ایک طرف نبی اکرمؐ نے لوگوں کو ناحق مال کھانے اور سودخوری وغیرہ کی ہلاکت آفرینی سے آگاہ کیا اور زکوٰۃ صدقات کی صورت میں انفاق فی سبیل اللہ کی تلقین کی تو دوسری طرف یہ تعلیم دی کہ **واللہ الغنی وانتم الفقرا** (محمد:۳۸) اور اللہ غنی ہے اور تم سب محتاج ہو۔'' نیز انہیں خودداری اور عزتِ نفس کا ولولہ انگیز درس بھی دیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے افضل ہے۔'' ایک طرف آپؐ نے اہل ثروت کو یہ شعور بخشا کہ اللہ کے دیئے ہوئے مال سے غربا یتامیٰ اور مساکین کا حصہ نکالنا ان پر کوئی احسان نہیں ہے، بلکہ ان کا حق ہے۔

''ان کے مالوں میں مقررہ حق ہے سائل ومحروم کا۔'' (المعارج۔24،25)

اس حق کی عدم ادائیگی پر قرآن پاک میں بدترین اور دردناک عذاب کی خبر سنائی گئی:

''دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اس سونے چاندی پر آگ دہکائی جائیگی اور پھر اس دن لوگوں کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزا چکھو۔''

(التوبہ:۳۴۔۳۵)

اور دوسری طرف حضورؐ نے محنت کی عظمت کا بھی نا قابل فراموش سبق سکھایا۔حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ایک محنت کش صحابی تھے۔ہتھوڑا چلاتے چلاتے ان کے ہاتھ میں گٹے پڑ گئے۔حضورؐ نے ان کے ہاتھ میں کھردرا پن محسوس کیا۔حضرت سعدؓ نے عرض کیا۔''اپنے اہل وعیال کی روزی کے لئے روزانہ ہتھوڑا چلاتا ہوں۔'' آپؐ نے ان کے ہاتھ چوم لیے اور فرمایا:''یہی وہ ہاتھ ہے جس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتے ہیں۔''(اسد الغابہ)

رزق حلال کے لئے جدوجہد کو بھی رسولؐ نے جہاد قرار دیا۔صحابہ کرامؓ نے ایک مضبوط جسم والے نوجوان کو حج کے موقع پر تلاش معاش کے لئے نکلتے دیکھا تو فرمایا:''کیا ہی اچھا ہوتا جو اس شخص کی صحت اور پھرتی اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف ہوتی۔''اس پر حضورؐ نے فرمایا:''ایسا نہ کہو کیونکہ اگر وہ مانگنے سے بچنے اور لوگوں کا محتاج نہ ہونے کے لئے محنت کرتا ہے تو وہ اللہ کی راہ میں ہے اور اگر اپنے ماں باپ یا بال بچوں کی پرورش کے لئے محنت کرتا ہے تو وہ بھی اللہ کی راہ میں ہے۔''

توکل علی اللہ ایک مومن کی بنیادی صفت ہے۔حدیث پاک ہے۔''اگر تم اللہ تعالیٰ پر صحیح معنوں میں توکل کرو گے تو وہ تمہیں بھی پرندوں کی طرح رزق دے گا۔وہ صبح خالی پیٹ نکلتے اور شام کو بھرے پیٹ واپس آتے ہیں۔'' یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پرندوں کو ان کے گھونسلوں کے اندر بیٹھے بیٹھے رزق دینے کی بات نہیں کی۔پرندے اپنے گھونسلوں سے باہر آ کر تلاش رزق کے لئے نکلتے ہیں۔تب انہیں اپنا حصہ رزق حاصل ہوتا ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ اسلام توکل کے کسی راہبانہ تصور کو ہرگز قبول نہیں کرتا۔اپنے اہل وعیال کے مستقبل کی فکر کرنا ضرورت دین میں سے ہے۔ایک صحابی حضرت جابر بن عبداللہؓ نبی کریمؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنی تمام دولت فی سبیل اللہ وقف کرنے کی خواہش ظاہر کی۔آپؐ نے دریافت فرمایا کیا تمہاری اولاد ہے؟ جب انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ اپنے پیچھے اپنی اولاد کو اس حالت میں نہ چھوڑ کہ وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں (بخاری) رسول اللہؐ بنی نضیر والی کھجوریں فروخت کر کے اپنے اہل خانہ کیلئے ایک سال کی خوراک کا بندوبست کرتے تھے۔(صحیح بخاری) امام بخاریؒ نے کتاب الزکوۃ میں ایک الگ باب اس امر کے بیان میں باندھا ہے کہ بہترین صدقہ وہ ہے جس کو دینے کے بعد بھی دینے والے کے پاس اتنی رقم رہ جائے کہ وہ دوسروں سے مستغنی ہو سکے۔

بہت سی تدبیروں کے باوجود بھی بہت سے با صلاحیت لوگ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ایسے لوگوں کے لئے قطعاً مناسب نہیں کہ وہ لوگوں کی زکوٰۃ وصدقات اور عطیات کے منتظر رہیں۔بہترین منصوبہ بندی سے ایسے لوگوں کو بھی اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جا سکتا ہے۔سچ کہا گیا ہے''کسی کو مچھلیاں پکڑنے کا فن سکھا دینا اس سے بہتر ہے کہ اسے خیرات کے طور پر کھانے کے لئے روزانہ ایک مچھلی مہیا کی جائے۔''سیرت النبیؐ میں ایسی ہی خود کفالت کا عملی درس دیا گیا ہے۔ایک صحابیؓ دربار رسالتؐ میں سائل بن کر حاضر ہوئے۔ان کے ہاں صرف ایک کمبل اور ایک پیالہ تھا۔آپؐ نے ان سے دونوں چیزیں منگوائیں اور صحابہؓ کے سامنے فروخت کے لئے پیش کر دیں۔ایک صحابیؓ نے ایک درہم قیمت لگائی۔حضورؐ نے قبول نہ کی اور کسی دوسرے گاہک کی طرف دیکھا۔دوسرے صحابیؓ نے انہی اشیا کے لئے دو درہم کی پیشکش کی۔دونوں درہم لے کر آپؐ نے سائل کو دے کر فرمایا کہ ایک درہم سے کلہاڑی خریدو۔وہ کلہاڑی خرید لایا تو آپؐ نے اپنے دست مبارک سے اس میں دستہ لگایا۔پھر آپؐ نے انہیں جنگل میں لکڑیاں کاٹنے کے لئے بھیج دیا اور ساتھ ہی ہدایت فرمائی کہ پندرہ یوم سے قبل ملاقات کے لئے حاضر نہ ہوں۔اس وقفے کے بعد آپؐ نے ان کا حال دریافت فرمایا۔انہوں نے عرض کیا کہ اس دوران انہیں دس درہم کی آمدن ہوئی۔اس آمدنی میں سے چند درہم ضروری کپڑوں اور اناج کی خرید کے لئے صرف کئے گئے۔نبی اکرمؐ نے فرمایا:''یہ اس سے بہتر ہے کہ تم کسی سے بھیک مانگو اور قیامت کے دن رسوائی اٹھاؤ۔''(جامع ترمذی،ابن ماجہ)

☆......☆......☆

سیدہ عائشہ صدیقہؓ!

مادرِ اسلام بی بی عائشہؓ
طیبہ و طاہرہ و صادقہ

اُمہات المومنیں میں منفرد
عورتوں میں ہیں عظیم المرتبہ

آپؓ سے مروی حدیثیں بے شمار
آپؓ نے پایا غضب کا حافظہ

باوقار و بانصیب و باحیا
علم میں یکتا ، ہنر میں کاملہ

دسترس رکھتی تھیں ہر میدان میں
طب و تاریخ و علوم دینیہ

ذی شعور و متقی و صابرہ
شاعرہ و عالمہ و فاضلہ

دی گواہی آپؓ کی قرآن نے
کی خدا نے خود براتِ عائشہؓ

آپؐ کے ہمدم طبیعت آشنا
آپؓ سے خوش تاجدارِ انبیاءؑ

عمر بھر انؓ کے رہا پیشِ نظر
دینِ حق کی سالمیت اور بقا

عائشہؓ مینارہِ صبر و رضا
محسنہِ ملتِ اسلامیہ

دخترِ صدیقِ اکبر السلام!
مرحبا اے مصطفیٰؐ کی اہلیہؓ !

شمیم فاطمہ

غزل

زمیں پر آسماں رکھا ہوا ہے
مجھے بھی درمیاں رکھا ہوا ہے

چھپا کر مجھ سے اپنے راز لاکھوں
مجھی کو راز داں رکھا ہوا ہے

بنا دیکھے اسے تا عمر چاہیں
یہ کیسا امتحاں رکھا ہوا ہے

یقیں پر بھی یقیں آتا نہیں ہے
یقیں میں بھی گماں رکھا ہوا ہے

میں خود کو بھی نظر آتا نہیں ہوں
مجھے آخر کہاں رکھا ہوا ہے

روانی دل کے دریا میں کہاں تھی
محبت نے رواں رکھا ہوا ہے

فضا میں میری آہوں کے علاوہ
سکوتِ جاوداں رکھا ہوا ہے

کرامتؔ یہ کرامت ہے غزل کی
مجھے اس نے جواں رکھا ہوا ہے

کرامت بخاری

غضب کی نا گہانیاں

جو دائروں میں گھومتی حیات ہے ممات ہے
نظام ہست و بود ہی بنائے کائنات ہے
کہیں خوشی کا دن چڑھے کہیں اندھیری رات ہے
عجیب واردات ہے

زمیں جو سب کی ماں بھی ہے شفیق و مہرباں بھی ہے
خزاں کی داستان بھی بہار کا سماں بھی ہے
جو آئے باز پرس پہ تو قہر بے اماں بھی ہے
یقین بھی گماں بھی ہے

کئی سمندروں کو چشمِ ناز سے پیے ہوئے
پہاڑ جیسی رفعتوں کو پیر میں لیے ہوئے
بدلتے موسموں کے رنگ پرُ فشاں کیے ہوئے
لبِ فغاں سیے ہوئے

دکھا رہی ہے خالقِ عظیم کی نشانیاں
جتا رہی ہے ہم کو اس کی ساری مہربانیاں
سنا رہی ہے عبرتوں بھری کئی کہانیاں
غضب کی ناگہانیاں

مگر کہ ہم شرابِ جاں کے شر میں چور چور ہیں
فریب میں ہیں مبتلا حقیقتوں سے دور ہیں
ہوائے حرص میں گھری نگاہِ بے شعور ہیں
گرفتۂ فتور ہیں

یہ ناگہانیاں ہیں اب نہ جانے کس کی گھات میں
چھپی ہیں دشت و بن میں یا کہ تیری میری ذات میں
میانِ کوہسار یا کہ سینۂ فرات میں
بسیطِ کائنات میں

نجمہ یاسمین یوسف

غزل

سمتِ بادِ مخالف چل
وقت کے سانچے میں مت ڈھل

ہے میری عظمت کا نشاں
میرے کاندھے پر یہ ہل

کچھ آنسو کچھ داغِ دل
اس دنیا میں سچ کا بدل

سوچ رہا ہوں تیرے بن
کیسا ہوگا اک اک پل

ہے دل تیرا کام یہی
دھیمی دھیمی آنچ میں جل

پتھر بن کے ڈھونڈ لیا
غم سے چھٹکارے کا حل

لے پر سازِ دل کی حبیبؔ
آؤ چھیڑیں کوئی غزل

حبیب الرحمٰن

غزل

ہو جتنی دیر میں ہم سے یہ داستان رقم
وہ اتنی دیر میں کرتے ہیں ایک اور ستم

نہ جانے کتنا بڑا حوصلہ ہے یاروں کا
دیے ہی جاتے ہیں ہر روز ایک تازہ غم

شریکِ محفلِ جاناں تو ہیں یہ قید بھی ہے
اٹھے نگاہ تو لیکن ذرا اٹھے کم کم

یہیں قریب ہے دیکھو وہ قاتلِ مسکیں
زباں کو روک لو آئے نہ لب پہ آہِ ستم

نہ آشنا کوئی باقی ، نہ سنگی و ساتھی
کہاں سے آئے کوئی دل کشا صدائے صنم

بڑے وقار کا سودا ہے معاملہ دل کا
نہ ہو زبان پہ شکوہ ، نہ آنکھ ہی ہو نم

غبارِ راہ ہے حدِ نظر ، جدھر دیکھو
نہ کوئی موڑ نہ پگڈنڈیاں ، نہ نقشِ قدم

ذکیہ فرحت

گواہی

صائمہ صبح سویرے بچوں کیلئے ناشتہ تیار کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔اس کا دل انجانے اندیشے سے لرز اٹھا کہ الٰہی خیر کی خبر ہو۔

دوسری جانب نگہت تھی۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی کہ ایک خاتون انتقال کر گئی ہے۔گیارہ بجے اس کی میت فلاں جگہ لائی جائے گی تو کیا وہ اسے غسل دینے کیلئے وہاں آ سکے گی۔

نیکی اور پوچھ پوچھ۔ صائمہ نے فوراً حامی بھر لی۔ وہ تو ایسے موقعوں کی تاک میں رہتی تھی کہ کب کوئی مدد کیلئے بلائے اور وہ بھاگم بھاگ پہنچ جائے۔

شادی کے کچھ عرصہ کے بعد صائمہ اپنے میاں کے ساتھ امریکہ رہائش پذیر ہوگئی تھی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ جس علاقے میں وہ رہی تھی ، وہاں اردگرد کئی خاندان اسکے ہم وطن و ہم زبان بھی آباد تھے اوردوسری اقوام کے بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے لوگ بھی موجود تھے۔آس پاس کے لوگوں میں صائمہ اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے ہر دلعزیز تھی۔اس نے اپنے جان پہچان والے لوگوں کو کہہ رکھا تھا کہ جب بھی ان کو کسی قسم کی مدد درکار ہو، وہ بلا تکلف اس سے رابطہ کر لیں اور وہ ان کی ہر ممکن مدد کرے گی۔اس سلسلے میں اس کے شوہر بھی اسکے معاون تھے۔جب کبھی کسی مسلمان عورت کا انتقال ہو جاتا تو اکثر غسل دینے کیلئے صائمہ کو بلا لیا جاتا۔

مقررہ وقت پر صائمہ غسل دینے کیلئے پہنچ گئی۔ یہ ایک 87 سالہ بوڑھی انگریز خاتون کی میت تھی۔میت کے ساتھ اسکا نوجوان پوتا تھا اور اسکی انڈونیشین بیوی بھی، جو حجاب اوڑھے ہوئے تھی۔مرحومہ کی بہو بھی صائمہ کا ہاتھ بٹانے کے لئے کمرے میں چلی گئی۔اچانک صائمہ کی نظر میت کے ہاتھوں پر پڑی۔ اسکے ناخنوں پر مختلف رنگوں کی نیل پالش بہت بے ڈھنگے انداز میں لگی ہوئی تھی۔صائمہ نے اس بارے میں اس کی بہو کو توجہ دلائی تو وہ کہنے لگی۔

میری دو چھوٹی بیٹیاں ہیں۔ وہ دادی کے بستر کے آس پاس منڈلاتی رہتی تھیں اور بعض اوقات لاڈ پیار کے ساتھ دادی کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتی تھیں۔ان کی معصوم باتوں اور بچگانہ حرکتوں سے دادی بہت محظوظ ہوتی تھیں۔شاید اس وقت بستر پر لیٹے لیٹے ان کے لئے دنیا کا صرف یہی ایک خوش کن نظارہ رہ گیا تھا۔چونکہ دادی کو شروع سے نیل پالش لگانے کا شوق بھی تھا اور عادت بھی، اس لئے وہ کبھی کبھار بچوں سے فرمائش کر کے نیل پالش لگوا لیتی تھیں۔لڑکیوں کیلئے یہ ایک بہترین شغل تھا۔وہ تین چار رنگوں کی نیل پالش لے کر ان کے ناخنوں پر مختلف رنگ تھوپ دیتی تھیں۔

صائمہ نے اس کی بہو سے کہا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم دونوں بھاگم بھاگ نزدیکی بازار سے نیل پالش ریموور لے آئیں اور پھر اسکے ناخنوں سے نیل پالش اتار کر غسل دینے کی ابتدا کریں۔اس کی بہو مان گئی اور وہ دونوں اکٹھی نیل پالش ریموور لینے چلی گئیں۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی صائمہ نے پوچھا۔

کیا تمہاری دادی ساس شروع سے مسلمان تھیں یا بعد میں مشرف بہ اسلام ہوئیں؟ وہ انڈونیشین لڑکی یوں گویا ہوئی۔

دراصل میں اور میرا شوہر ہم دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔اسی دوران ہماری آپس میں جان پہچان ہوگئی اور میرے شوہر نے مجھ سے شادی کی درخواست کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں صرف ایک مسلمان مرد سے ہی شادی کر سکتی ہوں۔ چنانچہ وہ اسلام لے آیا اور ہم نے شادی کر لی۔شادی کے بعد میں گاہے گاہے اپنے شوہر سے اسکے

خاندان کے افراد کے بارے میں پوچھتی رہی ۔ وہ عموماً اس بات کو ٹال دیا کرتا تھا۔ جب میرا اصرار بڑھا تو اس نے بتایا کہ اس کی ماں اس کے بچپن کے دوران ہی کینسر میں مبتلا ہو کر داغ مفارقت دے گئی تھی ۔ باپ نے جلد ہی دوسری شادی کر لی۔ جب سوتیلی ماں سے اسکا وجود برداشت نہ ہوا تو اسے دادی کے پاس چھوڑ دیا گیا ۔ وہ چند برس دادی کے پاس رہا۔ پھر دادی نے بھی یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ مزید ذمہ داری اٹھانے سے قاصر ہے ۔ چنانچہ اسے سرکاری پناہ گاہ میں چند برس گزارنے پڑے ۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا لہٰذا اس نے مختلف جگہوں پر محنت مزدوری کر کے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کئے ۔ جب پیسے کم پڑے تو اعلیٰ تعلیم کیلئے حکومت سے بے حد آسان شرائط پر قرضہ لے کر تعلیم مکمل کی اور نوکری شروع کر دی۔

میں نے پوچھا کہ تم نے اپنے باپ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟

تو اس نے بتایا کہ میرے باپ کو نشے کی لت تھی جو وقت کے ساتھ بڑھتی چلی گئی ۔ اس کی دوسری بیوی سے بھی نہ بنی ۔ نشے کی وجہ سے وہ مجھ سے بھی لاتعلق ہو گیا اور میں نے بھی اس کی کمی کو محسوس نہ کیا ۔ کیونکہ ہمارے حافظے میں کسی بھی شخصیت کے بارے میں اچھی یا بری یادوں کا ذخیرہ ہوتا ہے ۔ اگر یادیں خوشگوار ہوں تو اس شخصیت کی غیر موجودگی سے دل میں کسک پیدا ہوتی ہے لیکن اگر یادیں اذیت ناک ہوں تو آپ اس شخصیت سے کنارہ کشی میں ہی عافیت سمجھتے ہیں ۔ باپ کے نشے کی وجہ سے میری ماں بھی ہمیشہ اس سے نالاں رہی اور مجھے یاد ہے کہ وہ کبھی بھی ہماری کسی بیماری، تکلیف یا مشکل گھڑی میں ہمارے ساتھ نہیں رہا۔ اس کی دنیا الگ تھی اور ہماری الگ ۔ ہم بیک وقت آپس میں رشتہ دار بھی تھے اور اجنبی بھی ۔ ماں کے مرنے کے بعد میں نے اپنے باپ کی طرح رشتہ داری کا بوجھ اپنے سر سے اتار دیا اور اجنبیت کو اختیار کر لیا۔ اسکے بعد میرا اس سے رابطہ ٹوٹ گیا۔

پھر میں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ اب اس کی دادی کہاں ہے؟ تو اس نے بتایا کہ وہ یہاں سے بہت دور ایک دوسرے شہر میں اپنے گھر میں اکیلی رہ رہی ہے اور کہ کافی عرصے سے اسکا اپنی دادی کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ۔ میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ میری خواہش ہے کہ کسی دن ہم ان کو ملنے کیلئے جائیں لیکن میرے شوہر نے میری بات کو رد کرتے ہوئے کہا کہ میری دادی کو اس ملاقات کی کوئی تمنا ہے نہ مجھے کوئی خواہش ہے ۔ وہ اپنی زندگی میں مگن ہیں اور میں اپنی زندگی میں خوش ۔ ویسے بھی ہمارے ہاں بعض اوقات ایسی یکطرفہ ملاقاتوں کو دوسروں کی زندگی میں مداخلت سمجھا جاتا ہے اور اسے سخت ناپسند کیا جاتا ہے ۔ اپنے شوہر کی بات سن کر میں خاموش ہو گئی۔

کچھ عرصے کے بعد ہمیں اطلاع ملی کہ بڑھاپے کی وجہ سے دادی بہت کمزور اور لاچار ہو گئی تھی اور اب گھر میں اکیلے رہنا اسکے لئے ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا وہ اپنا گھر چھوڑ کر اولڈ ہوم چلی گئی ہے ۔ میرے شوہر کیلئے یہ ایک معمول کی بات تھی لیکن میرے لئے یہ خیال سوہانِ روح تھا کہ ایک ایسی بے بس عورت جس کا اپنا پوتا موجود تھا لیکن وہ غیروں کے رحم و کرم پر تھی ۔ ایک ایسی کمزور عورت جس کی دیکھ بھال اس کے اپنے محبت اور چاہت کے ساتھ کر سکتے تھے لیکن وہ اجنبیوں کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور تھی ۔ ایک ایسی بوڑھی اور لاچار عورت جو ایک آرام دہ گھر میں اپنائیت، سکون اور سہولت کے ساتھ رہ سکتی تھی لیکن وہ اولڈ ہوم میں مجبوری کی تصویر بن کر لحہ بہ لحہ موت کا انتظار کر رہی تھی ۔ یہ سوچ سوچ کر میں بے چین ہو گئی اور مجھ سے رہا نہ گیا ۔ میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم دادی کو اپنے گھر لے آئیں ۔ میرے شوہر نے انکار کر دیا اور مجھے سمجھایا کہ ہمیں یہ سوچنا ہی نہیں چاہئے کیونکہ یہ بہت بھاری ذمہ داری ہے ۔ ویسے بھی اولڈ ہوم والے بوڑھوں کی دیکھ بھال بہت اچھے طریقے سے کرتے ہیں ۔ انکے کھانے پینے کا خیال بھی رکھتے ہیں اور علاج معالجے کا بھی ۔ اس لئے ہمیں اس بارے میں چنداں پریشان نہیں ہونا چاہئے ۔

میں نے کہا کہ میں یہ ذمہ داری اٹھانا چاہتی ہوں ۔ اگر اس دوران مجھے کسی دقت کا سامنا کرنا پڑا تو پھر ہم دادی کو واپس اولڈ ہوم بھیج دیں گے ۔ مجھے ایک موقع دے دو ۔ میں اپنے آپ کو آزمانا چاہتی ہوں ۔

میرا اصرار جاری رہا۔ یہاں تک کہ میرے شوہر کو ماننتے ہی بنی۔

میں نے اپنے گھر میں دادی کے لئے کمرہ تیار کیا۔ پھر ہم دونوں اولڈ ہوم چلے گئے۔ دادی سے ملے اور ان کو بتایا کہ ہم انہیں لینے کیلئے آئے ہیں۔ پہلے تو انہوں نے نا قابل یقین نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ پھر ان پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوئی اور وہ بخوشی ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگئیں۔ ہم نے انہیں گاڑی میں بٹھایا۔ ان کا مختصر سامان اور ان کی وہیل چیئر کو بھی تہہ کر کے گاڑی میں رکھا اور انہیں لے آئے۔

دادی کے آنے کی وجہ سے میرے روز مرہ کے معمولات میں قدرے تبدیلی آگئی تھی۔ بعض اوقات مجھے یہ ذمہ داری نباہتے ہوئے مشکل محسوس ہوتی تھی اور کبھی کبھار یہ پابندی گراں بھی گزرتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال بادِ صبا کے جھونکے کی طرح میرے دل کو تقویت دے جاتا تھا کہ میری کوئی بھی سوچ، میرا کوئی بھی عمل ضائع جانے والا نہیں۔ ایک ذات ہے جو ہر لمحہ دیکھ رہی ہے۔ ایک ذات ہے جو ہر لمحہ سن رہی ہے۔ ایک ذات ہے جس کے بے حد و حساب وسیع خزانے لا انتہا انعامات و اکرامات سے بھرے پڑے ہیں۔ جو میرے گمان سے بڑھ کر فیاض ہے۔ جو ہر وقت دینے کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔ اس ذات کے کان بھی ہمہ وقت میری طرف لگے ہوئے ہیں اور اس کی نظر بھی مسلسل مجھ پر ٹکی ہوئی ہے۔ بس یہ ذرا سا امتحان ہے۔ اس کو گزر جانے دو۔ پھر دیکھو کہ وہ ذات یقیناً میری ٹوٹی پھوٹی کارکردگی کا صلہ مجھے اپنے شایانِ شان دے گی۔ مجھے بھلا اور کیا چاہیے اس کی پسندیدگی کی سند، اس کی رحمت، اسکا فضل، اسکا کرم۔ یہی تو حاصل زندگی ہے۔

اس خیال کے ساتھ ہی میرے جسم میں نئی توانائی دوڑ آتی اور میں ہمت اور شوق کے ساتھ دادی کے کام کاج کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ ان کے پاس بیٹھ کر ان کے ماضی کے قصے بھی سنتی، ان کی بڑھاپے اور بیماریوں کی شکایات بھی اور ان کو یہ باور بھی کراتی کہ وہ اکیلی نہیں بلکہ ان کے ہر دکھ سکھ میں ہم ان کے ساتھ ہیں۔ کبھی کبھار میں شام کو دادی کو وہیل چیئر پر بٹھا کر اپنی بیٹیوں کے ہمراہ نزدکی پارک میں چلی جاتی۔ وہاں بچوں کی چہل پہل اور رنگ برنگے پھولوں کی رونق دیکھ کر وہ خوش ہو جاتیں۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ دادی کی کمزوری بڑھتی چلی گئی۔ جب کبھی ان کی طبیعت ناساز ہوتی تو میں نزدیکی کلینک میں فون کر کے اطلاع دے دیتی۔ وہاں سے نرس بھیج دی جاتی اور وہ فون پر ڈاکٹر سے مشورہ کر کے مناسب دوا دے دیتی۔ بعض اوقات دادی کی طبیعت بہت بگڑ جاتی تو اس صورتحال کے پیش نظر نرس کو ہمارے ہاں دو تین گھنٹے رکنا پڑتا۔

ایک دن دادی قدرے بہتر نظر آرہی تھیں۔ میں ان کے پاس بیٹھ کر ان کی کمر سہلا رہی تھی۔ وہ کہنے لگیں...... میں نے اپنی زندگی میں تم جیسا بے لوث انسان کوئی نہیں دیکھا تم مجھ جیسی نا کارہ اور بوڑھی عورت کے ساتھ ایسی محبت سے کیوں پیش آتی ہو؟ تم اپنے بچوں کی طرح میرا خیال کیوں رکھتی ہو؟ میری خدمت کرنے سے بھلا تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوگا۔

میں نے کہا کہ دادی! دراصل اس میں اصل فائدہ تو میرا ہی ہے یوں سمجھئے کہ آپ کی شکل میں میری لاٹری نکل آئی ہے۔

دادی نے حیرت سے کہا کہ میری بات ان کے پلے نہیں پڑی۔ لہٰذا میں آسان لفظوں میں انہیں سمجھاؤں۔

میں نے کہا کہ آپ کے سمجھنے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ میرے دین نے مجھے دوسرے انسانوں کے ساتھ حسن سلوک اور حسن اخلاق سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔ خاص طور پر کمزور بے بس، بے سہارا، معذور اور مظلوم انسانوں کے ساتھ اور پھر اپنوں کے لئے تو اس کی مزید تاکید کی گئی ہے۔ آپ ہماری اپنی دادی ہی تو ہیں۔ کوئی غیر تو نہیں۔

دادی کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ چند لمحے خاموش رہیں پھر کہنے لگیں۔

کیسا اچھا دین ہے تمہارا! میں نے کبھی کسی دین کو عام انسانوں کے لئے ایسا نفع بخش نہیں پایا۔ تمہارے دین کی وجہ سے میری زندگی کے یہ مشکل دن کتنے آسان ہو گئے۔ اپنے بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے

مجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑا اور پھر مجھے اس سے بدر جہا بہتر اور آرام دہ گھر بھی مل گیا اور تم جیسی بیٹی بھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں تمہارے دین کو اپنا لوں۔

میں نے خوشی سے کہا، کیوں نہیں!

انہوں نے پوچھا کہ اس کا طریقہ کیا ہوگا؟ میں نے کہا کہ اس کے لئے آپکو چند الفاظ عربی زبان میں ادا کرنے ہوں گے۔ یہ کہہ کر میں نے انہیں انگریزی زبان میں کلمے کے معانی بتائے۔ پھر میں کلمے کے الفاظ،لفظ بہ لفظ کہتی چلی گئی اور وہ میرے پیچھے پیچھے دہراتی چلی گئیں۔ کلمہ پڑھنے کے کچھ دیر کے بعد دادی پر غنودگی چھا گئی۔ ہم نے فون کر کے ایمبولینس منگوالی اور انہیں ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ دوسرے دن بے ہوشی کی حالت میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔

دادی کی روداد سن کر صائمہ بہت متاثر ہوئی اور کہنے لگی، واقعی مثبت اور اچھی سوچ سے اچھا اخلاق جنم لیتا ہے۔ پھر اچھا اخلاق اچھے کردار کو تشکیل دیتا ہے اور اچھے کردار کو اپنائے رکھنا ایثار کے بغیر ممکن نہیں۔تم نے اپنے کردار کے وار سے ایک انسانی دل کو فتح کر کے اس کے لئے فلاح کا راستہ کھول دیا حالانکہ کئی جید علماء اپنے زبان و بیان اور تقریر وتحریر کے باوجود کسی دل کو چھو نہیں پاتے۔اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ اچھے اخلاق والے لوٹ کر لے گئے۔

صائمہ اور مرحومہ کی بہو نیل پالش ریمور لے کر واپس لوٹے۔ میت کے ناخنوں کو صاف کر کے اسے غسل دیا اور پھر کفن پہنا دیا گیا۔ صائمہ نے رشک سے مرحومہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

کتنی خوش قسمت ہو تم کہ زندگی کے آخری لمحات میں حق کی گواہی دے کر رخصت ہوگئیں۔ کاش وقت آنے پر ہم بھی یہ سعادت پا لیں۔

☆......☆......☆

دوسرا راستہ

لٹ اُلجھی سلجھا جا رے بالم
میں نہ لگاؤں گی ہاتھ رے
لٹ اُلجھی..................

لاؤنج میں رکھے تخت پر بیٹھی ہما اپنے بالوں سے نبرد آزما تھی ہلکے ہلکے اس پرانے گیت کو گنگناتے ہوئے ......منظر کسی پرانی فلم کا محسوس ہو رہا تھا۔

چھوٹی بہن سیما اپنا ہوم ورک کرتے کرتے ایک نظر بہن پر ڈالتی قلم کا سرا منہ میں لے کر کچھ دیر اسے دیکھتی اور پھر مسکرا کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ حساب کے چند سوال اس کو سمجھ نہیں آرہے تھے ایک دو دفعہ بہن کو آواز دی کہ آکر بتا دیں ......لیکن انہوں نے یا تو سنا نہیں یا سن کر سنی ان سنی کر دی۔

ہونہہ! شہباز بھائی کے آنے کا ابھی کوئی امکان نہیں...... پتہ نہیں کیوں آواز پر آواز دیئے جا رہی ہیں۔ سیما کی زبان کچھ نہ کچھ چھیڑ چھاڑ کے لئے کلبلا رہی تھی لیکن وہ ضبط کئے بیٹھی تھی۔ حساب کے سوال کرانے تھے۔ سیما کو حساب جتنا مشکل لگتا ہما کے لئے اتنا ہی آسان تھا۔

چوتھی دفعہ سیما سے ضبط نہ ہوا۔

''باجی تیل لا دوں؟ ایسے تو شام ہو جائے گی۔''

''نہیں'' ہما نے سختی سے انکار کیا۔ سیما چپکی ہو کر بیٹھ گئی۔

رات کو کالج کی پکی سہیلی زارا کی بہن کی شادی تھی۔ جانے کے لئے بڑی مشکل سے ماں سے اجازت لی تھی۔ تقریب میں ہما کا بال کھول کر جانے کا ارادہ تھا۔ لمبے لمبے گہرے براؤن رنگ کے بالوں کو اس نے مہندی لگا کر اور خوبصورت سرخی مائل دے دیا تھا۔ نہا کر کنگھا کیے بغیر سکھانے سے ان میں ایک گھونگر سا آجاتا تھا۔ سو وہ کنگھے کے بغیر صرف ہاتھوں سے بال سلجھا رہی تھی۔ بہت احتیاط اور نرمی کے ساتھ ......ہونہہ ''تیل لا دوں'' کنگھا تو لگا نہیں رہی ہوں......تیل لگاؤں گی؟

سیما اب انتظار سے بیزار ہو گئی تھی، کاپی پنسل لے کر اپنا بستہ سمیٹنے لگی۔

''سلجھاتی رہیے بال میں ابا سے سمجھ لوں گی۔''

ہما نے بے نیازی سے اس پر ایک نظر ڈالی اور بالوں کا ایک ذرا زور سے جھٹکا دیا۔ تخت سے ایک بالشت لٹکتے ہوئے بال لہرائے اور پانی کے موتیوں کی ایک بارش سی فرش پر ہوئی۔

بیگ اٹھا کر جاتے جاتے سیما نے یہ منظر دیکھا۔ اس کے دل میں ہلکی ہلکی آگ سلگنے لگی۔ ''ہونہہ! بال بھی لمبے اور میتھ میں بھی تیز......'' سیما کے ہاتھ خود بخود اپنے بالوں کو ٹٹولنے لگے...... ہلکے سیدھے سلکی بال......اُس کی بے احتیاطی کے باعث امی انہیں ترشوا دیتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا جب سنبھالنے کے قابل ہو گی تو بڑھا لینا۔

شام کو ہما بڑی لگن سے تیار ہوئی۔ عید کا جوڑا جو صرف ایک دفعہ پہنا تھا وہ ہی نکالا تھا۔ امی نے بڑی ٹال مٹول کر کے اس جوڑے کی اجازت دی تھی۔ آخر اس کی ہونے والی سسرال سے جو آیا تھا۔

شہباز بھائی کی امی رمضان سے پہلے ہی دے گئی تھیں۔ جوڑے کے ساتھ اور بھی ڈھیر ساری چیزیں تھیں۔ میچنگ کی چپل خوبصورت جیولری، مہندی، پرفیوم اور ڈھیر ساری چوڑیاں......شہباز کی امی پرانے گھر کی پڑوسی تھیں۔ ابھی چار سال پہلے تک وہ لوگ وہیں ان کے برابر میں رہتے تھے۔ اسی سال شہباز کی خالہ جو لندن میں رہتی تھیں انہوں نے شہباز کو اپنے پاس بلا لیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے......شہباز کی امی نے بڑی جز بز کر کے بھیجا، وہ بھی اپنے میاں کے سمجھانے بجھانے

پر......انہیں آج کے حالات میں بھی سات سمندر پار سات سمندر پار ہی لگتا تھا۔ بھلا اتنے آرام سے کوئی آ جا سکتا ہے؟

سعودی عرب دوبئی یا مسقط ہوتا...... یہ تو قریب ہی ہیں!!

''ارے میری نادان مہرو بیگم! پڑھ لکھ لے گا تو پھر یہاں نوکری لگے گی نا۔تعلیم کے بغیر کچھ نہیں ہوگا......''

مہرو النساء کی سمجھ میں بات آ گئی اور انہوں نے شہباز کو کھلے دل سے جانے کی اجازت دے دی۔اب شہباز کی تعلیم مکمل تھی۔بیچ میں دو دفعہ شہباز نے کراچی کا چکر لگایا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ نہ ہما کے گھر والوں سے شہباز کی ملاقات ہوئی اور نہ ہی کسی نے کوئی خاص ضرورت محسوس کی۔اگرچہ شہباز کی امی مہینے دو مہینے میں ہما کی ماں سے ملنے آتی تھیں اور ساجدہ بیگم بھی اپنی پرانی یادیں تازہ کرنے اپنی سہیلی مہرو کے گھر چکر لگاتی تھیں لیکن بس فون پر ہی شہباز کے آنے اور جانے کا سنا۔مہرو اپنے رشتے داروں میں بیٹے کو ملانے بلکہ فخریہ ملانے میں مصروف رہیں اور ساجدہ بیگم نے بھی ان کی مصروفیات کا خیال کر کے ادھر جانے کا نہ سوچا۔

وہ تو جاتے جاتے اس دفعہ ماں نے شہباز کے کان میں ڈال دیا کہ وہ اس کے لئے لڑکی تلاش کر رہی ہیں اور جو رشتے داروں کے ہاں آئے دن چکر لگ رہے تھے وہ اسی لئے تھے۔شادی کا نام سنتے ہی شہباز نے ساجدہ خالہ کے بارے میں پوچھا۔ماں نے غور سے بیٹے کو دیکھا۔ آنکھوں کی جوت کی جگمگاہٹ کا عکس چہرے پر پڑ رہا تھا۔سمجھ گئی کہ بیٹا ساجدہ خالہ کو نہیں ہما کو یاد کر رہا ہے۔بچپن سے لے کر لڑکپن تک کیسا کیسا نہ تنگ کیا ہے۔ایک دفعہ تو سیما کے لمبے بالوں کی چوٹی کو ساجدہ خالہ کی چوٹی سے سُتلی سے کس کے باندھ دیا تھا۔سیما اس وقت یہ ہی آٹھ نو سال کی ہوگی، ماں کے ساتھ سو رہی تھی۔مہرو کو پاجامہ کاٹنا تھا قینچی مل کر نہیں دے رہی تھی۔شہباز کو بھیجا کہ ساجدہ خالہ کے ہاں سے لے آؤ اور وہ وہاں یہ کارنامہ کر کے آ گیا۔

مہرو کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ماضی کی چھوٹی چھوٹی باتیں بعد میں کتنی مزے کی لگتی ہیں۔مہرو نے پھر سے شہباز کو غور سے دیکھا۔

''کیا ہوا امی میں ساجدہ خالہ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں اور آپ مسکرائے جا رہی ہیں۔''

''مجھے تو ہما یاد آ گئی تھی۔تمہارے ساجدہ خالہ کو یاد کرنے سے...... اور خوب ہی یاد آئی۔'' امی ذرا کھل کر مسکرائیں۔شہباز جھینپ گیا۔

''ہاں تو کیا خیال ہے ہما کے بارے میں ہمارے بیٹے کا؟'' امی نے براہ راست سوال کر دیا۔''بھئی مجھے تو پسند ہے۔گھرانہ دیکھا بھالا ہے بچی کو بچپن سے جانتی ہوں۔بہت سادہ اور پیاری بچی ہے۔''

''دیکھ لیجئے اب بھی ایسی ہی ہے یا بدل گئی۔''

شہباز کے چہرے کی جوت جیسے اور بھڑک اٹھی تھی اور ماں کو تو بیٹے کا جواب بغیر کہے معلوم ہو گیا۔

''ابھی تمہارے جانے میں ہفتہ بھر ہے میں جاتی ہوں ساجدہ کے گھر......دیکھوں بچی کی بات کہیں طے نہ کر دی ہو۔''

یہ بھی ہو سکتا ہے! شہباز ذرا سنجیدہ سا ہو گیا۔

لیکن راستہ صاف تھا۔ساجدہ خالہ اور خالو دونوں کو رشتہ پسند آیا۔ وہ ہی خیال کہ دیکھا بھالا لڑکا ہے شریف خاندانی اور پڑھا لکھا......تو پھر اور کیا چاہئے۔

یوں ہما کے انٹر کے امتحان سے پہلے اور شہباز کے لندن سدھارنے سے پہلے بات طے ہو گئی۔بہت سادگی سے ہوئی۔ایک جگمگاتی انگوٹھی ہما کے ہاتھ میں پہنا کر مہرو نے ہما کے سر پر پیار کیا اور مٹھائی کھلا دی۔

ادھر مردانے میں ہما کے ابا نے شہباز کے ہاتھ پر رقم کا لفافہ رکھ کر مٹھائی کھلا دی۔دوسرے دن شہباز کی فلائٹ تھی۔ایک بار اچھی طرح دیکھنے اور ملنے کی خواہش دل میں کلبلاتی رہی لیکن شرمیلا بچہ تھا، اس خواہش کو زبان پر نہ لا پایا۔ادھر ہما کا بھی یہ ہی حال تھا۔

سچی بات ہے کہ اب ہما کچھ اتنی سیدھی سادی بچی نہیں تھی، کالج گرل تھی جہاں لڑکیاں طرح طرح کے قصے مزے لے کر سناتی ہیں، رائی ہو نہ ہو پہاڑ ضرور بنا لیتی ہیں۔بس یوں ہی کچھ فن کے لئے ہر لڑکی

اپنا آئیڈیل رکھتی ہے، پھر علی الاعلان اس کو بتانے میں فخر بھی محسوس کیا جاتا ہے، کیسا منگیتر ہے اور کیسا ہونا چاہئے؟ یہ دونوں موضوع اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ کتنی ہی بات کر کے کسی کا دل نہیں بھرتا۔

ایسے میں ہما کو اپنے لیے تو شاید اتنا نہیں لیکن سہیلیوں کو بتانے کے لئے تو ضرور شہباز کو اچھی طرح دیکھنے کا دل چاہ رہا تھا۔لیکن دل کی دل میں ہی رہ گئی اور منگیتر صاحب پھُر ہو گئے۔اور اب ایک سال بعد آنا تھا۔

دونوں کے والدین اس بارے میں یہ سوچے بیٹھے تھے کہ بچپن سے دیکھا ہوا ہے۔ادھر جلدی میں کوئی تصویری سیشن بھی نہیں ہوا۔شہباز اکلوتا کوئی بھائی نہ بہن جو یہ کام انجام دیتا اور سیما اور ہما بھی دو ہی بہنیں...... سیما نے سوچا تھا کہ ابا کے موبائل سے دو چار تصویریں کھینچ لوں گی لیکن عین وقت پر اسے بھی مردانے میں جانے کی اجازت نہ ملی۔

خیر جاتے جاتے ہما کے بہت سمجھانے بجھانے پر سیما نے شہباز بھائی کو اپنی اچھی سی تصویر ای میل کے ذریعے بھیجنے پر آمادہ کرلیا۔

کمپیوٹر سے آئی ہوئی تصویر دیکھ کر ہما کچھ دیر تو بس ساکت بیٹھی رہ گئی۔اللہ! یہ تو اچھا بھلا تھا،مگر اب کس قدر ہونق لگ رہا ہے...... گول شیشے کا چشمہ اڑے اڑے بال اور بے ترتیب سی داڑھی......

ہما کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اس سے بہتر تو سہیلیوں کو دکھاؤں ہی نہیں...... مذاق ہی اڑائیں گی۔ابھی پچھلے دنوں سلمٰی کا آئیڈیل کزن جو اب اس کے خیال میں منگیتر بننے کے آخری مراحل میں ہے، اس کی تصویر کو دیکھ کر ساری سہیلیوں نے داعش یا القاعدہ کا ممکنہ لیڈر قرار دیا تھا۔ ہما کو ساری سہیلیوں کے قہقہے یاد آ گئے۔ ہونہہ! شہباز کو تو وہ داعش یا القاعدہ کا تھنکر قرار دے ڈالیں گی۔بس اب چھوڑو بے کار ہی تم نے تصویر کے لئے ضد کی!

ہما نے اپنے دل کو سمجھا لیا۔ شہباز کی ساری شرارتیں بلکہ بدتمیزیاں یاد کر کے اس کا دل اس معاملے میں ڈرا ڈرا سا تھا۔ چپکے چپکے دعا تک کر ڈالی تھی کہ خدایا ہر چیز تیرے بس میں ہے کچھ اور راستہ نکال دے۔

پھر جب باتوں باتوں میں کالج میں زارا نے اُس کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس کی منگنی نہ ہوئی ہوتی تو وہ اپنے بھائی کے لئے کوشش کرتی تو ہما کا دل بجھ سا گیا۔زارا کے بھائی فوج میں کیپٹن تھے۔ ایک زبردست سے فوجی وردی میں اس کی ایک زبردست سی تصویر زارا ساری سہیلیوں کو دکھا چکی تھی۔ سب ہی بڑی رعب میں تھیں۔اب زارا نے بہن کی شادی کا کارڈ دیا اور شرکت کے لئے خوب اصرار کیا تو ہما نے سوچا کہ شاید یہ ہی دوسرا راستہ ہو۔

پیاری گھیر دار فراک پر سلور ننھے ننھے ستاروں کے پھول دمک رہے تھے۔ لمبے سرخی مائل بھورے بالوں کا آبشار سیاہ چادر اتارتے ہی جیسے بہہ نکلا ہو۔محفل میں کتنے ہی لوگوں نے دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ زارا نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔مردانہ اور زنانہ الگ الگ تھا۔لیکن زارا جب اپنی امی سے ملوانے لے کر گئی تو نہ جانے کہاں سے اُسی وقت زارا کے بھائی بھی ضروری کام سے وہاں آ گئے۔زارا چپکے سے مسکرائی۔ بعد میں بولی دیکھا میرے بھائی کو؟

ہما نے اُس کی بات پر خفگی بھرا تاثر دیا۔لیکن دل ہی دل میں گویا مرعوب سی تھی۔کیا زبردست ہیرو ٹائپ بندہ۔لمبا قد، وجیہہ،خوبصورت بال، سب طرح سے شاندار...... ایک نظر میں ہما کو سب بڑا شاندار لگ رہا تھا۔

واپسی کے لئے نکلتے نکلتے زارا نے ہما کو گدگدایا۔''پھر میں آتی ہوں امی کو لے کر کسی دن؟''

ہما کی ہلکی سی مسکراہٹ زارا کو اجازت نامہ ہی لگی۔زارا کو ماں کو منانے میں مشکل تو ہوئی کہ ان کا کہنا تھا کہ بھلا کوئی منگنی شدہ لڑکی کا رشتہ بھی لے کر جاتا ہے۔لیکن زارا کا کہنا تھا کہ ایک دفعہ کوشش کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔

ہما کی امی نے زارا اور اس کی امی کا خوشی کے ساتھ استقبال کیا لیکن مدعا سن کر حیران رہ گئیں۔وہ کچھ بول ہی نہیں سکیں۔کیا زارا اور اس کی امی کو ہما نے اپنی منگنی کے بارے میں نہیں بتایا......وہ سوچ سوچ کر پریشان سی ہو گئی تھیں۔منگنی کے باوجود ان کا اس طرح آنا ہما کی رضا

مندی سے ہوا ہوگا تو کیا اس کا مطلب ہے کہ...... ہما اپنی منگنی پر خوش نہیں ہے!! انہوں نے گھبرا کر یہ ہی نتیجہ نکالا۔ خود پوچھنے کی بجائے سیما کے ذریعے کہلایا کہ باجی سے کہو کیا بات ہے مجھے بتائے۔

''سیما! میری بہنا امی سے کہنا شہباز نے بچپن میں مجھے بہت تنگ کیا ہے۔یقیناً آگے بھی ایسا ہی کریں گے۔ویسے اصل بات یہ ہے کہ ان کی شکل مجھے بالکل پسند نہیں عجیب فضول سی ہے۔لیکن دیکھو یہ بات امی کو نہ بتانا وہ تو پہلے ہی شکل وصورت پر جانے کی قائل نہیں ہیں۔''

سیما بہن کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔لیکن وہ حیران سے زیادہ خوف زدہ تھی...... چھوٹی سی بات اتنی بڑھ جائے گی، اس کے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

''تم ڈرو نہیں بس امی سے یہ ہی جملہ جا کر کہہ دینا۔''

بہن کی سفید ہوئی رنگت اور آنکھوں سے جھلکتے خوف کو محسوس کر کے ہما نے اس کے کندھے تھپتھپائے جیسے کہہ رہی ہو۔''ہمت کرو''

آخر سیما نے ہمت کر ہی لی۔بہن کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئی۔بات تو صرف اتنی تھی کہ اس نے بہن کی ساری بے اعتنائیوں کا بدلہ لینے کا سوچا تھا۔بعد میں تو معاملہ کھل ہی جانا تھا۔شہباز نے کمپیوٹر سے تصویر تو بھیجی تھی۔لیکن ساری کارستانی اور''فوٹو شاپ''سیما کی تھی۔ پھر یہ ہی تصویر اس نے شہباز کو واپس بھی بھیجی تھی کہ دیکھ لیں باجی کو میں یہ تصویر دکھا رہی ہوں اور شہباز کا جواب ایک آنکھ بند کر کے قہقہے لگاتا اسمائیلنگ فیس اور ساتھ اوکے کا انگوٹھا تھا۔گویا اس نے بھی اس شرارت سے خوب لطف لیا تھا۔

سیما نے کمپیوٹر کھول کر اصل تصویر نکال لی تھی۔

''باجی! غور سے دیکھ لیں یہ ہیں ہمارے شہباز بھائی...... پورے ہیرو ہیں ہیرو...... ہیں نا۔''

سیما نے بہن کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا......لیکن وہ اسے کہاں دیکھ رہی تھی وہ تو پوری آنکھیں کھولے تصویر دیکھ رہی تھی۔جس میں ایک اچھا خاصا معقول شکل وصورت اور حلیے کا لڑکا مسکرا رہا تھا زبردست......اس نے دل ہی دل میں کہا۔

''اب ایسے بھی نا دیکھیں اصل چیز صورت نہیں سیرت ہوتی ہے۔''سیما نے شرارت سے بہن کا کندھا ہلایا۔

''تمہاری تو میں ابھی خبر لیتی ہوں''

ہما نے ہونٹوں پر آئی بے ساختہ مسکراہٹ دباتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر بہن کو پکڑنا چاہا لیکن وہ تو تیر کی طرح دروازے سے نکل گئی تھی جہاں امی چوکھٹ کا سہارا لیے کھڑی تھیں۔

☆......☆......☆

قانتہ رابعہ

زمیں پر قدم

''ارے کوئی ہے؟ ماجد...... ساجد...... بینا......کوئی جا کر دیکھے گیٹ پر کون ہے۔ بیل پر بیل دیئے جا رہا ہے کوئی۔'' امی باورچی خانے سے آواز دے کر بولیں۔

ساجد نماز پڑھ رہا تھا۔ بینا سو رہی تھی، ماجد موبائل فون پر گیم کھیلنے میں مصروف۔ کچھ دیر تو انتظار میں رہا کہ ساجد نماز پڑھ کر خود ہی گیٹ کھولنے چلا جائے گا، اتنے میں امی کی کڑکتی بجلی کی طرح آواز سنائی دی۔

''سارے کہیں مر مرا گئے ہو؟ آؤں میں یا......؟''

ماجد نے گیٹ کی طرف دوڑ لگائی۔ امی جب کہتی ہیں'' آؤں میں یا۔'' تو چند لمحوں کے اندر کسی بھی قسم کے جوتے، ڈنڈے جیسے ہتھیار سے لیس ہو کر ہی آتی تھیں۔

''کون ہے بھئی؟'' اس نے گیٹ کھولا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ آنے والا یا تو واپس جا چکا تھا یا پھر کسی بچے کی شرارت تھی۔ غصے سے جلا بھنا اندر آیا اور پھر موبائل فون لے کر صوفے پر ہی لیٹ گیا۔ ابھی گیم کا لیول دیکھا بھی نہ تھا کہ ''ابو کالنگ'' کے ساتھ ہی موبائل کی بیپ ہوئی۔'' السلام علیکم جی ابو۔ ماجد نے انتہائی ادب سے کہا۔

''وعلیکم السلام بیٹے امی سے کھانا پکڑو، راستے میں مارکیٹ سے آدھا کلو دہی لے لو اور جلد از جلد مارکیٹ پہنچو بہت سخت بھوک لگی ہے۔''

ابو نے تو پیغام دے کر فون بند کر دیا اور ماجد کا حال خراب۔

''کیا مصیبت ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ابو اور چچا کا کھانا لے کر مارکیٹ روانہ ہوا۔ خیال تھا کہ آنے جانے میں دس منٹ لگیں گے مگر شروع میں ہی ٹرین کا ٹائم تھا سو پھاٹک بند، پھر اگلے چوک پر سگنل نہیں تھا۔ دس کی بجائے ایک گھنٹہ دس منٹ میں واپس پہنچا تو پسینے سے شرابور، سخت حبس آتے ہی پنکھا چلانے کے لئے ہاتھ بٹن کی طرف بلند کیا تو منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''ارے بٹن تو آن ہے اور پنکھا پھر بھی بند۔''

''بھائی جان یو پی ایس خراب ہو گیا ہے۔'' بینا بھی گرمی کی وجہ سے نیند سے بیدار ہو چکی تھی، بولی

''کر لو گل۔'' کبھی اندر کبھی باہر......اللہ اللہ کر کے دو تین گھنٹوں کے بعد بجلی آئی مگر اب لیٹنے کا فائدہ نہیں تھا کہ مسجد میں عصر کی اذان ہونے والی تھی۔

ماجد کے دل میں کوئی حسرت سی حسرت تھی۔ اللہ گاؤں والے کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ شور شرابا نہ ایک سے دوسری جگہ جانے میں فاصلے، بجلی چلی جائے تو درختوں کے نیچے ٹھنڈی ہوا۔ یہاں بغیر صحن کے کوڑ گھر، تنگ گھٹے کمرے،......نہ گھر کے اندر چین نہ گھر سے باہر قرار۔ میرے بس میں ہو تو ساری زندگی کسی دیہات میں بسر کروں۔ سادہ طرز زندگی، محبت والے لوگ، خالص غذا، انسان کو اور کیا چاہیے۔

یہی سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی، اگلی صبح اٹھا تو پھر وہی چل سو چل، آئی کام کے پیپر دے کر فارغ تھا گھر میں ہر فرد کو اس کی شکل دیکھ کر کوئی نہ کوئی کام یاد آ جاتا۔ رات کو تھک ہار کر لیٹتا تو سب کے منہ پر ایک ہی بات ہوتی۔

''سارا دن تم نے کیا ہی کیا ہے؟''

لو جی! کام کر کر کے ہلکان ہو جاؤ تو بھی کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس کا پھوپھی زاد بھائی گاؤں میں رہتا تھا۔ کئی دفعہ وہ گھر والوں کو گاؤں آنے کی دعوت دے چکا تھا ماجد

کے ابا اور تایا کی زمینیں بھی ادھر ہی تھیں کیوں نہ وہاں جایا جائے۔ شہر کی زندگی سے دور ...... کوہ کے دامن میں نہ سہی گاؤں میں سہی جھونپڑا تو رہنے کو مل ہی جائے گا۔ جونہی ابا جان کو اس نے اپنا خیال بتایا انہوں نے فوراً حامی بھرلی۔ خلاف توقع سب گھر والے بھی چپ ہی رہے بلکہ تائی اماں نے تو یہاں تک کہا کہ

''اگر تمہارا دل لگ گیا تو وہیں گھر بنالینا۔ زمینوں کا ستیاناس ہوا پڑا ہے۔ کیا پڑا ہے شہر کے کاروبار اور نوکریوں میں جب اپنی سونا اگلتی زمینیں موجود ہوں۔''

''واہ تائی جان یہی تو میں سمجھانا چاہ رہا تھا۔'' جوش سے ماجد نے کہا اور چند گھنٹوں کے اندر اندر سامان تیار کیا اور ساجد اسے بس پر سوار کر کے گھر آ گیا۔

سارے سفر میں ماجد کا خوشی کے مارے برا حال تھا گاؤں میں شور شرابا ہوگا نہ افراتفری۔ نہ کاموں کا اوپر تلے انبار۔ چلیے جناب دو چار نیند کے جھونکوں، اخبار کے مطالعے کے بعد گاؤں کی حدود شروع ہوگئیں۔ بس سٹاپ پر اس کے پھوپھی زاد بھائی لینے آئے ہوئے تھے۔ اتر کر مصافحہ، معانقہ ہوا۔ رکشتہ پر بیٹھے، چند منٹ کے سفر کے بعد کھیت شروع ہوگئے۔ لہلہاتی فصلیں، ٹھنڈی ہوا، آم کی چار سو خوشبو...... واہ! ماجد نے اپنے آپ کو تھپکی دی ...... شہری سڑی بسی زندگی سے نکلنے کی نادر ترکیب پر۔ چاروں طرف سبزے نے طبیعت پر خوشگوار اثر چھوڑا، ماجد کا جی چاہا مارے خوشی کے دھمال ڈالے۔ خیر گھر آیا۔ پھوپھی زاد بھائی کے بچے اور دوسرے گھر والے ملے۔ بہت محبت ملی اپنے آپ کو دوسری تھپکی اور شاباش دی۔ اب بتاؤ یہ خلوص اور محبت شہر میں مل سکتی ہے؟

''نہ نہ نہ۔'' خود ہی نفی کر کے وہ قریبی ٹیوب ویل کے برف جیسے پانی سے غسل کر کے آیا۔ واہ! مزہ سا مزہ ...... جنت میں بہتے پانی کی نہریں یاد آ گئیں۔ اپنے آپ کو تیسری تھپکی دی گھر پہنچے تو کھلے صحن میں درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانا کھایا۔

''واللہ۔'' پہلے لقمہ پر ہی وہ وجد میں آ گیا۔ دیسی، دیسی ہے دیسی مرغ کا گوشت، دیسی گھی، ہاتھ کی بنی سویاں، دہی کا لبالب بھرا پیالہ۔ ہر لقمہ پر اس کا رواں رواں رب کا شکر ادا کرتا رہا۔ نہ نہ کرتے ہوئے بھی اس نے تین روٹیاں کھالیں۔ صبح ناشتہ بھی ہلکا کیا تھا پیٹ بھر کے کھانا کھانے اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں ایسا مدہوش ہو کے سویا کہ آنکھ کھلی تو ظہر، عصر، مغرب سب نمازیں قضا ہو چکی تھیں۔

اُف! اتنی دیر سویا رہا ...... امی ...... ایک دم یاد آیا، یہ تو گاؤں ہے۔ واہ! ایک اور تھپکی۔ بس زمیندار بننے کا پروگرام پکا ہو گیا۔

کچھ دیر ٹی وی دیکھا اور پھر لیٹ گیا، زیادہ کھانے اور لیٹے رہنے سے کچھ بدہضمی سی محسوس ہوئی تو پھوپھو زاد بھائی نے پھکی لا دی۔ کافی فرق محسوس ہوا۔

اگلے دن مرغ کی بانگ کے ساتھ آنکھ کھلی۔ نماز ذکر اذکار کے بعد وہ آج کے دن کی پلاننگ کرنے لگا۔ ناشتے میں پیڑے والی لسی، دیسی گھی کے تڑتڑاتے پراٹھے اور اچار، دہی کا پیالہ تھا جسے گھر والوں کے حکم کے مطابق ہر صورت میں ختم کرنا تھا۔ بڑے مزے سے اس نے ناشتہ کیا اور کھیتوں کی طرف چل دیا۔ تقریباً ہر گلی میں چار پائیوں پر اسی طرح لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

ایک دم سے اللہ جانے آسمان پر کون سی آفت نازل ہوئی کہ منٹوں سیکنڈوں میں دن کی روشنی سیاہی میں اور گرد و غبار میں بدل گئی۔ تیز طوفانی ہوا۔ آندھی کی شاں شاں ...... راستہ نظر نہیں آ رہا۔ پیچھے سے کہیں دو کتے لڑتے بھونکتے اس کی طرف لپکے۔ ماجد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سامنے دوڑ لگائی اور غڑاپ کی آواز کے ساتھ قریبی کھالے کے اندر!

اُف میرے خدایا ...... کیچڑ والا مٹیالا پانی ...... پاس کھڑے لڑکے کھی کھی کر کے ہنستے رہے، مجال ہے جو ہاتھ آگے بڑھا کر باہر نکالا ہو۔ اور وہ کتے کہیں کے اللہ جانے کدھر دفعان ہو گئے۔ تین چار منٹوں کے بعد آندھی کا زور تھما تو تیز بارش اور اولے شروع ہو گئے۔

مسجد میں اعلان ہوا۔ ''محمد رضوان چوہدری، محمد عرفان چوہدری کے گھر آئے پروہنے کہیں گم ہو گئے ہیں، نیلی شلوار قمیض پہنی ہوئی ہے ...... جہاں کہیں بھی ہیں فوراً گھر آ ئیں۔''

اُف ساری تھپکیاں اب ڈنڈے سوٹوں میں بدل گئیں۔ ہائے

اس کا اعلان ہوا، وہ بھی مسجد میں......

شرم سے پانی پانی ہو کر وہ کھالے سے نکلا۔ جب تک بارش نہیں تھی درخت کے نیچے بھیگتا رہا۔تیس پینتیس منٹ کے بعد بارش کم ہوئی تو اس نے گھر کا راستہ لیا۔ دل چاہ رہا تھا کسی چادر سے منہ سر لپیٹ لے یا سلمانی ٹوپی پہن لے۔ ''محمد رضوان کا پروہنا'' پہچانا نہ جائے۔ گھر میں سارے اس کے لئے پریشان تھے۔

کدھر گئے تھے......کیا ہوا؟ وغیرہ کے سوالات سے استقبال ہوا، بارش اور اولوں کے پانی سے ٹھنڈ لگ رہی تھی، نل کے نیچے بیٹھ کر خوب نہایا، کپڑے بدلے۔لکڑیاں گیلی ہو چکی تھیں وگرنہ چائے کی شدید طلب تھی، موسم درست ہونے تک کمبل میں دبکا رہا۔ جو بچہ پاس سے گزرتا کھل کھلا کر ہنستا......اتنی گرمی میں کمبل!

نالے میں گرنے سے ٹانگ پر چوٹ لگی تھی درد بھی کافی ہو رہا تھا گھر والوں سے ذکر نہ کیا ایسے موسم میں کہاں لے کر جائیں گے۔ جیب میں درد کی گولی پڑی تھی وہی لے کر کھالی۔ مگر درد تھا کہ زیادہ ہی ہو گیا یہاں تک کہ رات سر پر آ گئی ٹانگ کا درد اور پھر خوب کپکپی کے بعد شدید بخار......آنکھوں میں جلن...... پیٹ میں درد۔ اپنے گھر میں ہوتا تو خوب ہائے وائے کر کے سب کو اکٹھا کرتا، ساری رات درد سے اور بخار سے تڑپتا رہا صبح پھوپھو زاد بھائی نے ہاتھ لگا کے دیکھا اور پریشانی سے بولے۔

''ہائیں تمہیں تو بہت زیادہ بخار ہے۔'' چلو شہر چلتے ہیں یہاں تو نیم حکیم اور عطائی قسم کے ڈاکٹر ہی ہیں۔''

''نہیں بھائی جان مجھے بس پر سوار کر دیں۔ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔'' وہ نقاہت سے بولا۔ گرم چائے، امی کی گود، ابو کا روزانہ دم کرنا کچھ بھی تو نہ تھا۔

''نہیں بھئی پہلے ٹھیک ہو جاؤ پھر جانا۔ ایسے بیماری میں تو مشکل ہے۔'' پھوپھو زاد بھائی گویا ہوئے۔

''میں نے درد کی اور بخار کی دوا لے لی ہے آپ بس مجھے بس پر بٹھا دیں اور ساجد کو فون کر دیں بس سٹاپ پر لینے کے لئے آ جائے۔''

ماجد نے ضد کی۔

''اتنی جلدی؟ کیا دل نہیں لگا بھائی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''بات دل لگنے کی نہیں بس یہ سمجھ میں آ گئی ہے اللہ نے شہر ہو یا دیہات پہاڑ ہوں یا جنگل ہر جگہ رہنے کے کچھ فوائد رکھے ہیں اور کچھ نقصانات، بس نوعیت بدل جاتی ہے۔ بندہ وہیں اچھا لگتا ہے جہاں اس کے سب گھر والے موجود ہوں۔''

ماجد نے چار پائی سے پاؤں نیچے اتارتے ہوئے کہا۔ اپنے گھر جانے کے لئے بہر حال قدم تو زمین پر رکھنا پڑتا ہے۔

☆......☆......☆

رخسانہ اقبال راؤ

اپنا اپنا امتحان

رمضان کا مہینہ تھا، مسز ناصر صبح کے وقت اپنے روز مرہ کے کاموں مشغول تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

دروزہ کھولا تو ایک کمزور و لاغر حاملہ عورت کھڑی تھی۔ گرمی اور دھوپ سے بے حال تھی سو مسز ناصر نے اندر آنے کو کہا۔ وہ چھاؤں میں آتے ہی ٹھنڈے فرش پر لیٹ گئی۔ پانی کا پوچھا تو پتہ چلا کہ روزہ ہے۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' وہ پوچھنے لگیں۔

''جی میں بانو ہوں۔''

اس نے نقاہت سے جواب دیا پھر پوچھنے پر مزید گویا ہوئی۔

''ہم کچھ عرصہ پہلے گاؤں سے شہر آئے تھے کہ محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کو تعلیم دلوائیں گے۔ باجی میں قرآن شریف پڑھی ہوئی ہوں اور مجھے بڑا شوق ہے کہ میرے بچے پڑھ لکھ جائیں۔ اسی وجہ سے ہمیں گاؤں میں اپنے سسرال والوں کو ناراض کر کے شہر آنا پڑا کیونکہ وہاں بہت جہالت ہے۔''

''اچھا تو کتنے بچے ہیں تمہارے اور میاں کیا کرتا ہے؟''

''بس باجی بندہ سوچتا کچھ ہے اور اللہ کو کچھ اور ہی منظور ہوتا ہے۔ ہم کرائے پر گھر لے کر رہنے لگے اور میاں وین ڈرائیور بن گیا۔ چار بیٹیاں ہیں میری...... میں نے بڑی دونوں کو سکول داخل کروا دیا سات اور پانچ سال والی کو۔ چھوٹی ابھی چار اور دو سال کی تھیں۔ اچانک ایک دن میاں کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ کام سے معذور ہو کے اب چار پائی پر پڑا ہے۔ باجی گاؤں والے تو پہلے ہی مجھے بیٹیوں کی وجہ سے بدقسمت کہتے تھے اور اب تو میاں کا علاج اور گھر کا کرایہ، بچوں کا پیٹ بھرنا سب میرے سر پر آ پڑا۔ میں نے گھر میں کام شروع کر دیا مگر آٹھویں مہینے کے حمل کی وجہ سے بڑی مصیبت میں ہوں۔''

''اس حالت میں تو روزے کی چھوٹ ہے بانو۔''

''باجی اگر کچھ کھانے کو گھر میں ہوتا تو تب نا!''

مسز ناصر تو پہلے ہی نرم دل تھیں۔ ان کا دل پسیج گیا۔

انہوں نے راشن کے علاوہ اسے کافی کچھ دیا اور سب سے اہم بات ہمدردی کے بول نے اس کے زخموں پر مرہم کا کام کیا۔

وہ کچھ مطمئن سی ہو کے چلی گئی۔ سال گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا اور خیر سے رمضان پھر آ گیا۔

مسز ناصر دورہ قرآن میں باقاعدگی سے جاتی تھیں اور آنے کے بعد وہ چاہتی تھیں کہ اب دو تین گھنٹے آرام کروں کوئی آمد و رفت نہ ہو مگر اس افراتفری کے دور میں جب کوئی کسی کی سنتا نہیں تو لوگ ایسے ہی دروازوں پر جاتے ہیں جو دکھ بانٹ لیں، جہاں عزت نفس بھی مجروح نہ ہو اور کام بھی بن جائے۔

سودسویں روزے بانو اپنے خوبصورت سے بیٹے اور چھوٹی بیٹی کو لے کر آن وارد ہوئی۔

''بانو کیا حال ہے اب تمہارا؟''

مسز ناصر نے پوچھا تو گویا پھر ایک درد بھری بپتا امڈ پڑی۔

''باجی! اللہ نے مجھے چار بیٹیوں کے بعد بیٹا دیا۔ مگر میرا شوہر فوت ہو گیا۔ سسرال والوں نے مجھے ہی منحوس کہا کہ میاں کو کھا گئی۔ باجی آپ ہی بتائیں میرا کیا جرم ہے؟ میں بڑی بیٹی کو چھوٹی بہنوں کے ساتھ گھر میں چھوڑتی اور چھوٹے بچے کو کمر سے باندھ کر گھروں میں کام کرتی رہی۔ اللہ والے مجھ پر ترس کھاتے اور ہمارا روٹی پانی چلتا رہا۔ میری بچیوں کو سکول جانے کا بہت شوق تھا مگر ان بچاریوں نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ ایک دن اچانک بڑی بیٹی کو کرنٹ لگ گیا اور وہ اللہ کو پیاری ہو گئی......'' یہ بتا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

مسز ناصر پریشان ہو گئیں۔ بچوں کو کچھ بسکٹ پھل وغیرہ سے بہلایا

اور بانو کو تسلی دی۔ اللہ سے امید رکھنے اور صبر و نماز سے مدد لینے کی تلقین کی ،مقدور بھر مدد کی اور رخصت کیا۔ بڑی دیر ان پر بانو کی باتوں کا اثر رہا۔

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو

یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

تیسری مرتبہ بانو ایک عجیب کہانی لے کر آئی۔ اب کے پہلے سے زیادہ پریشان تھی۔ بات بھی ایسی ہی تھی۔

''باجی میری بہن قتل ہوگئی۔''

''کیسے؟''

''باجی ہم غریبوں کے محلوں میں جہاں بھوک اور لاچاری ہو وہاں جھگڑے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ میرے بہن اور بہنوئی میں تو تکار تو اکثر رہتی تھی مگر یہ نہیں پتہ تھا کہ وہ کسی اور عورت میں دلچسپی لے رہا ہے۔ باجی سوکن تو اگر مٹی کی ہو تب بھی بری...... ایک دن میری چھوٹی بیٹی اپنی خالہ کے گھر رہنے گئی ہوئی تھی کہ میرا بہنوئی اپنی آشنا کو لے کر گھر آ گیا اور بیوی سے جھگڑنے لگا۔ شاید انہوں نے پہلے کچھ منصوبہ بنا رکھا تھا۔ انہوں نے میری بہن کو بے دردی سے قتل کر کے اس کی لاش کمرے کے کچے فرش میں گڑھا کھود کر دبا دی۔ دس دن کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ بہنوئی گھر کو تالا لگا کے بچوں کو بند کر جاتا۔ دو بہن کے بچے اور ایک میری چار سالہ بیٹی۔ ان کو ڈرا دھمکا کے چپ کرائے رکھا۔ ایک دن میں نے ہمسائے کے فون سے اپنی بہن کا نمبر ملایا تو اتفاق سے وہاں موجود میری بچی نے ہی فون اٹھا لیا اور بدحواسی میں سب کچھ مجھے بتا دیا۔

باجی میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میرے ہمسائے اسی وقت پولیس کو لے کر بہن کے گھر پہنچے۔ تالا توڑ کر بچوں کو نکالا۔ بھانجی اور بھانجا بہت سہمے ہوئے تھے۔ تین اور پانچ سال کے تو تھے ابھی۔ مگر میری بیٹی میری طرح غم سہ سہ کر ڈھیٹ ہوگئی تھی اس نے پولیس کو بڑی تفصیل سے سارا چشم دید واقعہ بیان کر دیا۔ پولیس والے بھی اتنی چھوٹی بچی کی صاف زبان اور جرأت پر حیران رہ گئے اور جھٹ پٹ سارا بیان قلمبند کر لیا۔

چند ہی دنوں میں بہنوئی اور وہ عورت دونوں گرفتار ہو گئے اور انہیں عمر قید کی سزا ہوگئی۔ باجی اب میں ان بچوں کا کیا کروں ...... میری بہن کی نشانی...... مجھ سے تو اپنے بچوں کا گزارہ نہیں ہوتا۔''

مسز ناصر تو گنگ ہو کے رہ گئیں۔

''اچھا میں کسی شیلٹر ہوم کا پتہ کرتی ہوں۔ اللہ کوئی راستہ ضرور نکال دے گا۔ تم فکر نہ کرو بانو! جس نے تمہیں آزمائش دی ہیں وہی پار بھی ضرور لگائے گا۔ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔''

پھر دو دن بعد مسز ناصر نے فون کیا تو پتہ چلا کہ بچوں کو ان کی دادی لے گئی۔ چلو یہ بھی ٹھیک ہوگیا۔ مسز ناصر نے سوچا اور سکون کا سانس لیا۔

لیکن ابھی آزمائش باقی تھی۔ آخری مرتبہ بانو آئی تو اس کی بیٹی کو کینسر ہوگیا تھا''باجی! پیٹ پر چھوٹا سا دانہ نکلا۔ وہ خارش سے چھل گیا اور جب چیک کرایا تو یہ انکشاف ہوا۔ باجی اب تو میری ہمت جواب دے گئی ہے۔ میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ جن کے ہم کام کرتے تھے انہوں نے تیس ہزار سے مدد کی۔ تین ہفتے شوکت خانم میں ذلیل ہوئے۔ آخر بڑی مشکل سے وہاں سے بچی کو نکالا۔ اب ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے کلینک میں ہے۔

باجی وہ ڈاکٹر انسان نہیں فرشتہ ہے۔ رہائش اور کھانا فری دیتا ہے۔ سب سے بڑھ کر توجہ اور ہمدردی کے میٹھے بول......''

مسز ناصر سوچ رہی تھیں کہ ایسے ہی لوگ تو زمین کا نمک ہیں اور اللہ کے غضب کو روکنے کا باعث بھی۔ چند لوگوں کی نیکیاں سب برائے نام مسلمانوں کا بھرم رکھ لیتی ہیں۔

''باجی میں صرف ٹیکہ اور دوائی کے لئے پیسوں کا انتظام کرنے نکلی ہوں مجھے مایوس نہ کرنا''بانو نے بڑی لجاجت سے کہا۔

مسز ناصر اس کی بات سنتے سنتے ہی فیصلہ کر چکی تھیں۔ وہ تو پہلے ہی اپنی بیماری کیلئے صدقہ نکالنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے انگلی سے اپنی قیمتی انگوٹھی اتار کر اس کو تھما دی۔

بانو کے جانے کے بعد وہ بڑی دیر سوچتی رہیں کہ انسانوں کو اس دنیا میں کتنی سخت آزمائشیں پیش آتی ہیں، ان کی حکمت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر ہمارے سوچنے کی بات تو ہے کہ کسی ایک پر آزمائش دراصل اردگرد رہنے والے دوسروں کی بھی آزمائش ہے کہ اپنے بھائی بندوں کو مصیبت میں دیکھ کر ہمارا کیا طرز عمل رہا؟ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ، کسی کو مشکل اور کسی کو سہولت دے کر آزمایا تو اللہ نے سب ہی کو ہے! اپنا اپنا امتحان ہمیں اپنی اپنی جگہ پاس کرنا ہے۔☆

مریم شہزاد

وہی روٹین

آج پھر فریحہ کی بڑبڑاہٹ کام کے ساتھ ساتھ جاری تھی ایسا لگتا تھا کہ اس پر بوریت کا دورہ پڑتا ہے۔

''اُف کیا بوریت ہے روز وہی ایک روٹین، صبح اٹھو، بچوں کو اسکول بھیجو ،پھر بڑوں کو ناشتہ کراؤ، پھر میاں کے کام، ان کا ناشتہ، کپڑے دیکھو، آفس چلے جائیں تو پھر روز کا وہی مسئلہ......سوچنے بیٹھ جاؤ کہ آج کیا پکائیں۔''

فریحہ کی ساس مسکراتی ہوئی اس کی بڑبڑاہٹ سنتی جا رہی تھیں اور قرآن پاک کی تلاوت بھی ساتھ ساتھ جاری تھی کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ دل کی بہت اچھی ہے، بس کبھی کبھی اس کو روٹین سے الرجی ہونے لگتی ہے۔

اتنے میں شاید اس کی کسی بہن کا فون آ گیا تھا کیونکہ اب وہ ان سے ڈسکس کر رہی تھی، ''آپ نے کیا پکایا، میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کیا پکاؤں۔ابھی سبزی والا آئے گا تو بھرے ٹھیلے کے آگے کھڑے ہو جاؤ مگر لگتا ہے سب چیزیں ابھی تو پکائی تھیں، روز ہی سوچنا پڑتا ہے، اچھا خاصا من وسلویٰ اترتا تھا، جی، جی اچھا ٹھیک ہے پھر بات ہوتی ہے۔''

دوپہر ہونے کو تھی بچے اسکول سے آنے ہی والے تھے کہ اچانک فریحہ کے پیٹ میں درد اٹھا اور ساتھ ہی کمر میں بھی ایک طرف درد شروع ہو گیا۔اس نے سوچا کہ ابھی ٹھیک ہو جائے گا گیس کا درد ہو گا۔مگر درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ ساس کے پاس آئی اور بتایا کہ درد ہے۔ انہوں نے کہا کوئی وزن وغیرہ اٹھایا تھا۔فریحہ بولی وہ تو روز کا معاملہ ہے ابھی پتیلی اٹھا کر پانی کولر میں ڈالا ہے۔یہ کہتے کہتے درد کی شدت سے اس کو الٹیاں شروع ہو گئیں۔

اب تو فریحہ کی ساس بھی گھبرا گئیں۔انہوں نے فوراً اسے درد کی ٹیبلٹ کھلائی مگر درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

بچے سکول سے آ گئے تھے اور ماں کو اس حالت میں دیکھ کر پریشان تھے ساس نے اس کی بگڑتی حالت دیکھ کر فوراً بیٹے کو فون کیا۔جلد ہی فریحہ کے شوہر آ گئے اور اس کو ڈاکٹر کے ہاں لے کر گئے، ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد کہا کہ گردہ کا درد لگ رہا ہے آپ الٹرا ساؤنڈ کرا لیں۔ ساتھ ہی کچھ ٹیسٹ بھی کرانے کو کہا۔ان الٹرا ساؤنڈ اور ٹیسٹ میں 3 سے چار گھنٹے لگے پتہ چلا کہ گردے میں پتھری ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر سے دوائی وغیرہ لے کر گھر پہنچے۔اس دوران بچوں نے دادی کو ٹھیک ٹھاک پریشان کیا ہوا تھا۔ماں کو دیکھ کر خاموشی سے بیٹھ گئے، دوسرا پورا دن بھی اور رات بھی اسی درد میں گزرے پھر دوائیوں سے پتھری نکل گئی تو اس کو چین آیا۔

صبح اٹھی تو آج فریحہ فریش تھی۔اٹھ کر بچوں کو اسکول بھیجا۔ساس اور میاں نے کہا کہ آج کا دن بالکل آرام کرو۔فریحہ کو بھی خاصی کمزوری محسوس ہو رہی تھی لہٰذا وہ چپ چاپ آ کر لیٹ گئی۔

باہر سے اسے سب آوازیں آ رہی تھیں۔ماسی فریحہ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر الٹا سیدھا کام کر کے جا رہی تھی۔ساس پریشان تھیں کہ کیا پکائیں۔میاں کو ان کے موزے نہیں مل رہے تھے۔

فریحہ کا دل ایک دم ہی بھاری سا ہو گیا وہ سوچنے لگی کتنی اچھی روٹین تھی میں سب کام سکون سے تندرستی کے ساتھ کر رہی تھی اور کتنی ناشکری تھی میں، کہ اتنی اچھی روٹین سے بور ہو رہی تھی۔ یہ ہی تو اصل زندگی ہے۔بیٹھے بٹھائے علاج اور دواؤں پر کتنی رقم اٹھ گئی۔

چلو وہ تو جان کا صدقہ ہوا مگر میاں بچے الگ پریشان ہو رہے ہیں۔ ساس اس عمر میں ہلکان ہیں۔بے چاری کو کتنا تردد کرنا پڑا، پورا گھر ڈسٹرب ہو گیا۔اب میں ناشکری نہیں کروں گی، اللہ کا شکر ہے جس نے جلد ہی صحت یاب کر دیا۔اگر خدانخواستہ کچھ زیادہ ہو جاتا تو......اس کے آگے سوچ کر ہی اس نے توبہ کر لی۔

اور دوسرے دن جب فریحہ اپنی روٹین پر آئی تو وہ ایک نئی فریحہ تھی جس نے اب روزانہ دو نفل شکرانے کے بھی پڑھنے کا عہد کیا تھا۔

☆......☆......☆

دلشاد نسیم

بسو کی ماں

بسو کی ماں کو مرے دو ماہ ہو چکے تھے مگر بسو کو ایک ایک پل ایسے یاد تھا جیسے کل کی بات ہو......اُس وقت مہینے کی آخری تاریخیں اور شروع گرمیوں کے دن تھے...... مار حبس نے سانس بند کر رکھی تھی۔ اسی میں بیمار ماں کو کھانستے کھانستے ایسی چپ لگی کہ وہ چپکی ہی رہ گئی۔ رات کے آٹھ بجے کی بات تھی، غریبی میں آٹا ایسے گیلا ہوا کہ بسو ہاتھ پیر ہی نہ مار سکا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ماں کو رات بھر گھر رکھنا تھا۔ ماں کی آخری خواہش تھی جنازہ روشنی میں لے کر جانا...... چند ایک صفیں بھی بھر گئیں تو مردہ بخشا جاتا ہے۔ گرمی اور حبس زندہ انسانوں کے لئے تو قابل برداشت ہے لیکن مردے کے لئے نہیں اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ زندگی سمجھتی ہے برداشت کرنا...... یا یہ کرنا بس اسی کا خاصہ ہے لیکن مردے کے مطالبے تو زندگی سے کہیں زیادہ نکلے......بسو پر یہ تلخ حقیقت پہلی بار آشکار ہوئی تھی اور ایسی ہوئی کہ اس کی آنکھ سے آنسو بھی نہ نکل سکا اور رونے اتنے تھے کہ اسے ماں کی میت پر رونے کی فرصت ہی نہیں مل رہی تھی۔ بسو کی بیوی بھاگاں نے اپنا میلا دوپٹہ سر سے اتار کے ماں کے چہرے پر کس کے باندھ دیا، وہ جو حالات کے ہاتھوں پہلے ہی اپنی اصل ساخت کھو چکی تھی اور کیا بگڑتی لیکن رسماً ایسا کرنا ہی تھا۔ اب سب سے بڑی پریشانی کفن دفن کی تھی۔ زندہ ماں اتنا پریشان نہیں کرتی تھی جتنا فکرمند اسے بے حس و حرکت پڑی ماں کر رہی تھی۔ اس نے بیوی کو تو ''کچھ کرتا ہوں'' کہہ کر مطمئن کر دیا مگر خود پریشان ہو کر گھر سے باہر بچھی مٹی سے اَٹی دری پر آ بیٹھا۔ آس پڑوس کے لوگ اظہار افسوس کرتے کرتے آخر میں یہ ضرور کہتے ''شکر ہے ماں کی مشکل آسان ہوئی۔''

لیکن یہ تو بسو جانتا تھا کہ ماں کی مشکل آسان ہوتے ہوتے اس کی مشکلیں کتنی بڑھ گئی ہیں۔ اس کا دماغ چک پھیریاں کھا رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے گا۔ آنے جانے والوں کا تانتا ختم ہوا تو اس نے بیوی سے کہا:

''بھاگوان میں جاتا ہوں......قبرستان دیکھتا ہوں...... کچھ کرتا ہوں''

اس کی بے ربط باتیں، پریشانی، بیوی کے لئے اجنبی نہیں تھیں۔ وہ سب سمجھتی تھی کہ اندر کھاتے بات کیا ہے۔ بیوی نے مردہ ساس پر ہمدردی کی نظر ڈالی اور پریشانی سے بولی......''ماں کو صبح تک رکھنا ہے بسو تو......برف کا انتظام کرنا ہوگا......''

''برف......؟'' بسو کا لہجہ اس قدر یخ تھا لگا اُسی پر برف پڑ گئی......''وہ کیوں؟''

''گرمی ہے......''

''ماں تو مرگئی ہے اس کو کیا خبر کہ گرمی ہے یا سردی......؟''

''پاگل پن کی بات نہ کر......تھوڑی دیر میں پیٹ پھول جائے گا''

بسو نے حیران ہو کر کہا ''ماں نے تو تین دن سے کھانا نہیں کھایا تھا...... پیٹ میں تو کچھ ہے نہیں تو پھولے گا کیا؟''

بھاگاں جھلّا گئی......''فاقہ بھی ہوا کر دیتا ہے۔ پھر بیماری نے جانے کیا سے کیا کر رکھا ہو۔ صبح تک رکھنا ہے تو برف کا انتظام کرنا ہوگا'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''انتظام......'' بسو نے دہرایا جیسے یہ لفظ اس نے پہلی بار سنا ہو۔

''جا کے چوہدری سے بات کیوں نہیں کرتے۔ سارا دن ان کی جوتیاں سیدھی کرتے رہتے ہو''

''جوتیاں سیدھی کرنے والے جوتی جیسے ہوتے ہیں پگلی۔ جوتے کی کون سنتا ہے۔ ذرا سی آواز نکالیں، مالک کوڑے میں پھینک دیتا ہے''

''بسو باتیں نہ بنا......جا کر بات کر کے آ'' بھاگاں نے اکتا کر کہا۔

بسو نے بیوی کو دیکھا ، پھر ماں کو ...... اس کے لہجے میں تلخی آ گئی......''اس سے تو اچھا تھا ماں زندہ رہتی ...... بھلے کھانستی رہتی ...... دوا ملتی تھی تو کھا لیتی تھی ۔نہیں ملتی تھی تو کبھی اُف نہیں کیا تھا بیچاری نے......اب مرگئی ہے تو چیزیں کتنی ضروری ہوگئی ہیں ۔ برف نہ ملی تو رات نہیں کٹے گی ۔زمین نہیں ملی تو دفن نہیں ہوگی ۔کفن نہ سلا تو......''

''بس کردے بسو۔'' بھاگاں بری عورت نہیں تھی ،تڑپ کر بولی'' یہ بولنے کا وقت نہیں ہے۔''

بسو نے ماں کو دیکھا۔سر سے پیر تک پتلی سی چادر اوڑھے لیٹی تھی......اس کا جی چاہا......ماں اٹھ جائے اور وہ کہے''ماں تُو سونے بھی نہیں دیتی۔''

یہی تو کہتا تھا وہ ۔ جب وہ رات بھر کھانستی اور ادوائن کی کھردری چارپائی کی چولیں ہلتیں تو......بسو کس قدر بے آرام ہوتا تھا۔

آج ماں کو دائمی آرام آ گیا مگر وہ پھر بھی بے آرام تھا۔رات کی تاریکی میں چلتے چلتے ماں کی وہ ساری باتیں یاد کرتے کرتے جنہیں اس نے کبھی کسی قابل بھی نہ سمجھا تھا......چوہدری کی حویلی آ گئی۔حویلی کا گیٹ دیکھ کر ہمیشہ اس کی نظریں جھک جایا کرتی تھیں......اور کیوں نہ جھکتیں۔ اس کی نوکری ہی کچھ ایسی تھی ۔ وہ چوہدری کی جوتیاں سیدھی کرنے اور چلم بھرنے پر مامور تھا۔اس کے عوض سال بھر کی گندم ہفتے وارانہ دو چار زناٹے دار تھپڑ کبھی کبھی لاتیں اور روزانہ کی دھتکاریں ملتی تھیں جسے وہ سر جھکا کے سنتا رہتا تھا۔وہ ذرا اور قریب ہوا تو اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ بند کمرے میں گھنگھروؤں کی آوازیں آرہی ہیں۔ مطلب چوہدری صاحب جاگ رہے تھے ۔ جوتیاں سیدھی کرنے والے نے ہمت کی۔ آہنی گیٹ کھلا اور وہ اندر آ گیا ۔ سب جانتے تھے کہ بسو کی ماں مرگئی ہے۔بسو کے ہم مرتبہ کمی ،بسو کے دکھ میں شریک تھے مگر اسے بانٹ نہیں سکتے تھے کیونکہ یہ سب جانتے تھے کہ بانٹنے کے لئے جیب میں کچھ ہونا چاہئے ۔ اسی لیے تو سب نے بھلا سوچا کہ ماں کی مشکل آسان ہوگئی ہے۔گویا موت نے ماں کو نہیں بسو کو شانت کر دیا ہے۔کسی ہمدرد پہریدار نے چوہدری کے کان میں کچھ کہا۔

چوہدری نے مخمور نگاہیں اٹھا کے بسو کو دیکھا اور ہمدردی سے بولا

''کیا بات ہے بسو،ماں مرگئی ہے......؟'' پہلی بار بسو کی آنکھ میں آنسو آ گئے ۔ وہ پہلے ہی سر جھکا کے کھڑا تھا اور بھی جھک گیا۔نظریں زمین پر گڑی تھیں ۔ چوہدری کو دیکھے بغیر ہاتھ جوڑ دیئے کہ جیسے ماں کو وہ زندہ ہی کردے گا......

''تو شکر کیوں نہیں کرتا......اچھا ہوا مرگئی۔''بسو کا دل پسلیوں سے نکل آیا......''بیماری کا گھر'' آخر بسو کی ماں تھی۔''کفن دفن کا انتظام ہو جائے گا......کہہ دیا ہے قبرستان میں۔''

''آپ مائی باپ ہو سرکار......آپ کے در کا کتا ہوں۔ بھلے اگلے سال اناج نہ دینا۔ابھی تھوڑے پیسے چاہئیں سرکار۔''وہ منمنایا۔

''پیسے......کیوں؟''

گھنگھرو بجنا بند ہو چکے تھے، طبلے کی آواز خاموش تھی۔سب اس کیوں کا جواب مانگ رہے تھے۔

''سارا انتظام تو کر دیا ہے پیسے کیوں چاہئیں تجھے؟''بسو چوہدری کے چہرے پہ لکھی نفرت پڑھ لیتا تو شاید تھوک کے چلا جاتا۔

''ماں کے لئے برف لے کے جانی ہے۔رشید برف والا کہتا ہے کہ پیسے کے بغیر برف نہیں دے گا۔ سرکار گرمی بڑی ہے ۔ صبح تک ......''

چوہدری کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''برف میں رکھے گا ماں کو حرام خور......کبھی پانی میں برف ڈال کے پی تیری ماں نے ،اب اسے برف میں رکھے گا۔'' چوہدری پھنکارا۔''یہ چونچلے کہاں سے سیکھ لیے تو نے؟''

''وہ جی......میری گھر والی نے کہا ہے......''وہ ہکلا گیا۔

''ماں مرہی گئی ہے تو جا کر ڈال اسے قبر میں......انتظام کر تو دیا ہے گڑھے کا......نہ کوئی تیرے آگے ہے نہ پیچھے...... تجھے کس کا انتظار ہے ؟جورو کی مانتی ہے تو جا کے بول اس سے کرے انتظام برف کا۔''

بسو نے اسی طرح رکوع کی حالت میں ہاتھ جوڑ دیئے اور منت سے کہا'' سرکار سورج چڑھے گا ، دو چار خدا کے بندے جنازے میں آجائیں گے۔ماں کی بڑی خواہش تھی۔کہتی تھی سات صفیں ہوں تو مردہ بخشا جاتا ہے۔''

''دفع ہو جا کے دفنا دے بڈھی کو.....'' اس نے پیر سے دھکا دیا۔
''بات سنو اس کی، اس نے برف لینی ہے۔'' اس نے مذاق اڑایا۔ اس کے لہجے کے غرور کو گھنگھرو پہننے والی معمولی طوائف نے بھی محسوس کیا۔

لاچار وہ کمرے سے نکل آیا۔ برف کا انتظام نہ ہو سکا۔ اس نے دل گرفتگی سے ماں کے پیروں کے پاس بیٹھ کر بیوی سے کہا۔ ''اگر میں نے اتنی چاہت سے ماں کے لئے دوا کا انتظام کیا ہوتا تو آج یہ نہ مرتی۔''

''موت کا دن تو اوپر والے نے لکھا ہے۔'' بھاگاں لاکھ نرم خو تھی لیکن مرنے والی اس کی ماں نہیں تھی۔ اس لئے میت کے سامنے کسی بھی طرح کی بات کہتے اس کے دل کو ہاتھ نہیں پڑ رہا تھا۔ بسو کی تو جیسے آنکھیں کوری ہو گئیں۔ چھوٹ چھوٹ کئی کنکر اس کے پپوٹوں کے درمیان بچھ گئے تھے جیسے سمندر کی ریت سارا پانی پی گئی۔ بسو نے ماں کو دیکھا، اسے لگا ماں کا پیٹ اب پھولنا شروع ہو چکا تھا۔ وہ گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں قبرستان جا رہا ہوں.....''

بسو کو بھیج کر بھاگاں چار گھر چھوڑ کر نہلانے والی کمو مائی کو بلا لائی۔ کفن بھی چوہدری نے بھجوا دیا تھا۔ کمو مائی نے ماں کو نہلایا ہی نہیں اس کا نام بھی بدل دیا۔ کفن ہاتھ میں پکڑ کر کہنے لگی ''میت کا کفن تو چھوٹا ہے۔''

ہائے ہائے۔ بھاگاں نے سر پیٹ لیا۔ کفن خیرات کا تو تھا ہی ترس کا مارا بھی نکلا۔ غریبی کا مذاق اڑاتا ہوا۔ بھاگاں کا دل غم سے آدھا ہو گیا۔

''غریب نے ساری عمر لگا کر بیٹے کو بڑا کیا، گھر پالنے جوگا کیا مگر بدنصیب کو پورا کفن بھی نصیب نہ ہو سکا۔'' ادھر گورکن مٹی کھود چکا تھا، سر کو باہر نکال کر بولا۔

''لے دیکھ لے، قبر ٹھیک ہے؟''

بسو نے حیرت سے گورکن کو دیکھا۔ ''قبر تو قبر ہے..... یہ کیسے ٹھیک یا نہ ٹھیک ہو سکتی ہے؟''

گورکن ہنس کر بولا۔ ''دیکھنا یہ ہے کہ اس میں تیری ماں پوری آ جائے گی یا نہیں۔''

''اچھا.....!'' بسو نے معصومیت سے سر ہلایا اور قبر میں اتر کے اندازہ لگانے لگا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی ماں اس کے بازوؤں میں آ جاتی تھی۔ ابھی چھ ماہ پہلے ہی اتفاقاً اسے ماں کو گود میں اٹھا کر ڈسپنسری لے جانا پڑا تھا۔ اس رات ماں پر کھانسی کا دورہ پڑا تھا اور وہ دل میں اس حادثے کے لئے خوفزدہ ہو رہا تھا جو اس روز نہ ہوا تھا، آج ہو گیا۔ تب، جب اس نے ماں کو گود میں اٹھایا تھا اسے یاد آ رہا تھا کہ ماں کس قدر بے وزن ہو چکی ہے..... یہ قبر تو کافی بڑی تھی ماں کو کیسے پوری نہ آتی۔ بسو نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ گورکن بولا..... ''چل پھر ماں کو جلدی سے لے آ۔'' اس نے احسان جتایا۔ ''چوہدری صاحب کا آڈر نہ ہوتا تو رات کو کبھی کام نہ کرتا۔''

بسو معمول کی طرح گھر لوٹ آیا جہاں ماں ادھورا کفن پہنے بے خبر لیٹی تھی۔ بھاگاں نے گھر آتے بسو کو دیکھ کر رقت سے کہا: ''بسو ماں کا کفن پورا نہیں ہے۔''

بسو نے عام سے لہجے میں کہا..... ''کوئی بات نہیں۔ قبر تو پوری ہے، غریبی میں ایسا ہوتا ہے۔ سر ڈھکو تو پیر ننگے اور پیر ڈھکو تو سر.....'' بولتے بولتے وہ چپ ہو گیا۔ پھر لمبا سا سانس لے کر حسرت سے کہنے لگا ''کیا تھا جو گرمیاں نہ ہوتیں سردی ہوتی..... برف کی ضرورت نہ ہوتی۔ ماں کی آخری خواہش پوری ہو جاتی۔ نمازیوں کی سات نہیں تو تین صفیں بن جاتیں۔ ماں بخشی جاتی۔''

اس نے ماں کو اپنے ہاتھوں سے کشادہ قبر میں اتار دیا۔ گنتی کے دو چار لوگ شریک ہوئے۔ ایک تو رات اس پر بسو ذات کا کمی۔ اس نے جنازے کے ساتھ چلتے دو تین لوگوں کو دیکھ کر سوچا جہنم تو کمیوں سے بھری ہو گی۔

ماں کو مرے دو مہینے ہو چکے تھے۔ ادوائن کی کھری چارپائی سونی ہو چکی تھی۔ رات نہ کوئی کھانستا نہ چارپائی چرچراتی۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ کورے گھڑوں میں پانی ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ چھٹے پہ بیٹھا رشید برف والا اپنی دکان چمکا رہا تھا۔ بسو جوتیاں سیدھی کرتا رہتا تھا، سو کر رہا تھا۔ چاند کی چاندنی میں کچے صحن میں لیٹے لیٹے بھاگاں نے یکدم کہا ''بسو تو شہر کیوں نہیں چلا جاتا.....''

بسو نے کروٹ لی اور بے اعتنائی سے بولا۔

''سنا ہے شہر کے لوگ پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی جوتیاں خود پہنتے

ہیں ۔ وہاں چلم بھی نہیں بنتی ۔سب سگریٹ پیتے ہیں ۔ وہاں میرا کیا کام؟''

بھا گاں چپ ہوگئی ۔ گہری خاموشی میں شور اٹھا، بسو نے کان لگائے ۔ بین کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں ۔ میاں بیوی نے خاموشی سے ایک دوسرے کی زبان کو سمجھا اور اپنی اپنی چار پائیاں چھوڑ کر باہر نکل گئے ۔ باہر کیا نکلے پیروں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی ۔ چوہدری شہر سے آتے ہوئے کار کے حادثے میں موقع پر ہی مر گیا ۔منٹوں سیکنڈوں میں پورا گاؤں حویلی کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی بسو کی ماں تھوڑی مری تھی ، چوہدری کا انتقال ہوا تھا ، وہ بھی اچانک ۔ روتے دھوتے طے پایا چوہدری کو صبح گیارہ بجے دفنائیں گے۔ برف کے کئی بلاک منگوائے گئے ۔بسو نے سنا کوئی کہہ رہا تھا آخر دور دراز سے یاروں، دوستوں اور عزیز داروں نے چوہدری کا منہ دیکھنے آنا تھا۔ منہ دیکھنے پر بسو کو یکدم خیال آیا۔ کیوں نہ وہ بھی آج چوہدری کا منہ دیکھ ہی لے ۔ ساری عمر اس نے چوہدری کے پیر دیکھے تھے ، پیر ہی کھائے تھے ۔اس کا کام ہی ایسا تھا۔ چلم بھرتا جوتیاں سیدھی کرتا اس کی نظر چہرے تک کیسے جاتی ۔ اس کی نظر میں چوہدری بس ایک ہیولہ تھا۔ میت نہلا کفنا کے کھلے میدان میں دیدار کو رکھی جا چکی تھی ، بسو نے بھی لوگوں کے کندھوں کے درمیان سے سر اٹھایا اس نے دیکھا اور حیران رہ گیا چوہدری کا کفن بھی بالکل ایسا ہی سفید تھا جیسا اس کی ماں کا کفن تھا۔ ہاں بس یہ فرق ضرور تھا کہ یہ چوہدری کو پورا تھا مگر افسوس وہ آج بھی چہرہ نہ دیکھ سکا اور اس کی خاطر چوہدری کے منہ سے کون کپڑا ہٹاتا۔

کسی نے آ کر چوہدری کے بیٹے وجاہت اللہ کو بتایا کہ قبر تیار ہوگئی ہے۔ وجاہت اللہ نے فکر مندی سے پوچھا۔'' قبر میں کسی نے اتر کے دیکھا ہے؟ آخر میرے ابا جی کی قبر ہے...... چوہدری فراست اللہ کی...... اسے تنگ نہیں ہونا چاہئے ۔''

جانے بسو کے جی میں کیا آئی ۔ وہ جو سر اٹھائے اس انتظار میں تھا کہ کب کوئی معتبر آئے اور چوہدری پر سے چادر اتاری جائے اور اس کی خواہش پوری ہوجائے، یکدم بولا'' سرکار اگر برا نہ مانیں تو میں جا کر دیکھ لوں ۔''

چوہدری وجاہت نے دکھی مسکراہٹ کے ساتھ کمال فراخدلی کا ثبوت دیا اور کہا......'' تیرا حق زیادہ ہے ۔جتنی تو نے ابا جی کی خدمت کی ، تجھے اس کا اجر تو ملنا چاہیے۔ چل تو اپنا شوق پورا کر لے جا کے ۔'' بسو جانے کے لئے پلٹا کہ اسے آواز آئی ۔'' اچھی طرح سے دیکھنا اندر لیٹ کر۔''

بسو گھبرا گیا۔ نیچی آواز میں بولا'' سرکار میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں جی...... جہاں مائی باپ نے لیٹنا ہے میں وہاں پہلے کیسے لیٹ جاؤں ۔''

'' بے وقوفا......ابا مر گیا ہے۔ اب اسے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے ۔''

بسو واقعی بے وقوف تھا ۔ اسی لیے ہونقوں کی طرح سر ہلا کر قبرستان آ گیا۔ قبر میں اترتے اترتے اس نے مٹی کو ہاتھ میں لے کر محسوس کیا......ایک بار پھر حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں ۔ یہ مٹی بھی بالکل اس کی ماں کی قبر کی مٹی جیسی تھی ۔قبر میں لیٹ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ اس کا لمبا چوڑا چوہدری فراست اس میں سکون سے لیٹ سکتا ہے ۔ وہ خوشی خوشی باہر نکلا اور حویلی کی طرف بھاگ گیا۔ اس پر شادیٔ مرگ طاری تھی کہ جس مٹی میں اس کی ماں سو رہی ہے، آج چوہدری بھی اسی مٹی میں سونے والا ہے ۔مگر حویلی پہنچ کر اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے ۔ ڈرتے ڈرتے بولا'' سرکار مائی باپ کی شان میں کمی نہیں آئے گی ۔ میں نے اندر جا کے دیکھا ہے ۔ بالکل بسو کی ماں کی قبر جیسی کھلی قبر ہے ۔''

(سہ ماہی فنون)

......☆......☆......☆

صائمہ اسما

نیو یارک میں چند روز

’’خوفناک‘‘ عورتیں

میں ریسٹ روم میں تھی جب ایک گوری داخل ہوئی اور میری قمیص کے گریبان پر ہوئی کڑھائی پر فریفتہ ہوگئی۔ پاکستان کا نام سن کر کہنے لگی، میں ایک بار بھارت گئی تھی۔ عرض کی پاکستان بھی آیئے۔ کہنے لگی، کیا پاکستان محفوظ ہے؟ میں اس سوال کا پہلے بھی سامنا کر چکی تھی ،کہا، جی ہاں، اتنا ہی محفوظ جتنا یہ آپ کا نیو یارک ہے۔

وہ ایک لمحے کو چپ ہوگئی، اسے میرے جواب سے شاید اپنے سوال پر شرمندگی ہوئی تھی۔ پھر اپنا کارڈ بڑھاتے ہوئے بولی، میں کینیڈا سے ہوں۔ میں بھی خفیف ہوئی کہ بلاوجہ اسے امریکی سمجھ لیا۔ پھر اس نے چرچ سنٹر میں ہونے والے اپنے ایونٹ میں شرکت کی پُر زور دعوت دی۔ میں نے فلائر پر نظر ڈالی۔ ٹورانٹو کی ایک آئی این جی اوتھی جو خواتین کی تولیدی صحت، چھاتی کے کینسر اور خصوصاً ان دونوں کے اسقاط حمل سے تعلق پر آگاہی دے رہی تھی۔ ظاہر ہے یہ ’’پرولائف‘‘ گروپ تھا۔ میں نے کہا یہ بہت اہم موضوع ہے آپ لوگوں نے کانفرنس کے مین سیشن میں یہ پروگرام کیوں نہیں رکھا، کہنے لگی، بس کیا بتاؤں وہاں کچھ ’’خوفناک قسم‘‘ کی عورتیں بہت حاوی ہیں اور ایسے پروگرام نہیں ہونے دیتیں۔

بیجنگ پروگرام ہے کیا؟

عورت کے حقوق کے یو این کنونشن سیڈا (CEDAW) اور بیجنگ لائحۂ عمل پر مسلمان، ترقی پذیر، ایشیائی اور مشرقی ممالک کو تو بہت زیادہ تحفظات رہے ہیں، اور ان کے علاوہ ویٹی کن اور دیگر مذاہب کی تنظیموں نے بھی اس سے ناخوشی کا اظہار کیا ہے، مگر خود جدید مغربی معاشرے میں بھی اس کی مخالفت کی کمی نہیں۔ ابتدائی مرحلوں میں ان خیالات کے حامی تمام گروہ مؤثر لابنگ کر کے کچھ شقوں پر اثر انداز ہونے میں کامیاب رہے تھے۔ مگر اب وقت کے ساتھ یہ مغرب کے ان ’’الٹرا لبرل‘‘ گروہوں کی بالادستی میں ہے جن کو خود ان کا اپنا معاشرہ بھی بہت قبولیت نہیں دیتا مگر مخصوص نظریاتی و معاشی مفادات کا پروگرام رکھنے والے ایسے طبقے ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں جن کا اثر و نفوذ مغربی ممالک کی حکومتوں میں بھی ہے۔ انہی گروہوں کی وجہ سے ’’عورتوں کی تقویت‘‘ کے یہ منصوبے بین السطور ہم جنس پرستی، اسقاطِ حمل، طوائف بازی اور پورنوگرافی قسم کے حقوق کے منصوبوں کا رنگ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ پاکستان نے جب اس پر دستخط کیے تھے تو اس وقت وزیر اعظم بینظیر بھٹو صاحبہ کی حکومت نے کچھ تحفظات کے ساتھ اس کو تسلیم کیا تھا کہ ہم اپنی حاکمیتِ اعلیٰ اور آئین کے منافی شقوں پر عمل کے پابند نہ ہوں گے۔ پاکستان سمیت بہت سے دیگر ممالک کے ایسے تحفظات الگ دستاویز کی صورت میں اس کنونشن کے ساتھ موجود ہیں۔

اس کے باوجود بیجنگ لائحہ عمل کی بہت سی کامیابیاں بھی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ عورت کی بحیثیت انسان برابری کا تصور دنیا بھر میں عام ہوا ہے۔ اگرچہ ہم جیسے ملکوں میں ہنوز دلی دور است۔ دوسرے عالمی سطح پر عورتوں کے حقوق کے حوالے سے ایک مشترک ایجنڈے کی صورت گری پر پیش رفت ہوئی ہے۔ پھر لوگ اپنے اپنے ممالک میں عورتوں کی حق تلفی پر مبنی رویوں اور قوانین کے بارے میں Sensitize ہوئے ہیں۔ حکومت کی بجائے افراد، اداروں اور تنظیموں کے کردار پر بہت زور ہے۔ خواتین پر ظلم و تشدد کے خلاف آگاہی دینے میں میڈیا کے استعمال کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس کے باوجود بہت کچھ ایسا ہے جو اس پروگرام کے حقیقی ثمرات کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

مگر یہ مسئلہ زن........!!

دراصل بنیادی فکری ڈھانچہ مسائل کی ٹریٹ منٹ میں بہت اہم ہے۔۱۹۹۵میں جب یہ لائحہِ عمل پیش ہوُا تو ویٹ کن کی طرف سے ہارورڈ کی پروفیسر میری این گلینڈن نے اسے ۱۹۷۰ کے مردہ فیمینزم کو زندہ کرنے کی کوشش قرار دیا، جو اس کے الفاظ میں مردوں، شادی اور مامتا کے بارے میں منفی خیالات، اور اسقاطِ حمل پر انتہائی سخت موقف کی بنا پر رد ہو چکا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ ہم نے ہر چیز جوڑے میں پیدا کی تا کہ نسل چلے (۴۲۔۱۱) مذکر مؤنث دو اصناف بنائیں (۹۲۔۳) لڑکے اور لڑکی میں فرق ہے (۳۶۔۲) مگر اعمال کی جزا میں صنف کا کوئی فرق نہیں (۴۰۔۴۰) سوال یہ ہے کہ ایک طرف عورت پن کی بنیاد پر سارے منظرنامے کی تشکیل وتعبیر ہو رہی ہے، دوسری طرف عورت کی امپاورمنٹ پر بات کرتے کرتے جب آپ نے نسوانیت اور مردانگی کے بنیادی فرق ہی کو یہ کہہ کر زمیں بوس کر دیا کہ یہ تو ہمارا خود ساختہ ہے (Socially constructed)، تو اب ہم کس بنیاد پر ان دونوں کے متوازن انسانی حقوق متعین کریں؟ خاص کر معاشی مساوات پر مبالغہ آمیز زور کے ساتھ اس کا سیدھا سا نتیجہ تو یہ ہے کہ عورتیں ہر معاملے میں مردوں کی طرح ہو جائیں اور پھر اس کا فائدہ بھی مردوں کو ہی پہنچے گا کہ وہ اپنی ذمہ داروں سے فارغ ہوتے جائیں گے۔

اور اب تو اس معاملے میں مغربی فکر ایک قدم اور آگے بڑھ چکی ہے جہاں ایسے خیالات کو بھی شرفِ مباحثہ دیا گیا ہے جو نہ صرف صنفی، بلکہ جنس کے فرق کو بھی خود ساختہ قرار دے دیں (جیسے جوڈتھ بٹلر)، یعنی آپ کو کس جنس میں رہنا ہے اس کا فیصلہ آپ کی 'پرفارمنس' پر ہے، تو ان فکری بنیادوں پر پروان چڑھنے والا لائحہِ عمل کس صنف کو فائدہ دے گا؟

نہ رہے گا بانس....!

اس اندازِ فکر کی بازگشت بیجنگ پروگرام کے ہر نکتے میں سنائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک مین میٹنگ سیشن میں جہاں مختلف ممالک کی رپورٹوں پر بیحد سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی، ایک مرد مندوب نے یہ کہہ کر ماحول زعفران زار کر دیا کہ عورت کے اس مسئلے کا تو بس ایک ہی حل نظر آتا ہے، کہ عورتیں کم عورتیں (نازن؟) اور مرد کم مرد (نا مرد؟) ہو جائیں۔

مگر تفنن برطرف یہ بہت بلیغ فقرہ تھا اور مغربی معاشرے پر گہرا طنز بھی۔ وہاں ایک طرف فیمینزم ہے جس کے نزدیک مرد اور خاندانی زندگی عورت کے تمام مسائل کی جڑ ہیں، تو دوسری طرف ہم جنس پرست (LGBT) ہیں جنہوں نے انسانی معاشرے کی الگ ہی تعبیر وتشریح کر رکھی ہے۔ان دونوں کا یہاں اس قدر اثر ورسوخ ہے کہ مسودوں میں جا بجا الفاظ کا چناؤ مروجہ تصورات کے مطابق ہونے کی بجائے ان دو طبقات کو تحفظ دینے پر مبنی نظر آتا ہے۔خاندان کی تشریح میاں بیوی سے نہیں بلکہ مجموعہِ افراد سے کی گئی ہے۔جوڑے (Couple) کی بجائے ساتھی (Partner) کے الفاظ ہیں اور ماں یا مامتا (Motherhood) کی بجائے Caregiver ، گویا بنیادی انسانی حقوق کی تعبیر وتشریح میں اتنا آگے نکل گئے کہ نسلِ انسانی کی بقا کا معاملہ بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

مدّ مقابل یا معاون؟

اول تو اصناف کو ایک دوسرے کے مدّ مقابل کھڑا کر کے ''عورت پن'' کی بنیاد پر کوئی مستقل فکری ڈھانچہ کھڑا کرنا یا Activism کرنا خود محلِ نظر ہے۔انسان ہونے کے ناطے ہر ایک معتبر ہے اور اگر کوئی تقسیم ہے تو وہ صحیح اور غلط کی تقسیم ہے۔مغربی فکر کا منتہا ومقصود بھی ایک ''مشترک درست'' تک پہنچنا ہی ہے۔لہٰذا اصل اہمیت صنف کی نہیں، درست اندازِ فکر کی ہے اور اس نکتے کو اس لحاظ سے یو این کے مذکورہ پروگرام نے بھی قبول کیا ہے کہ ۱۹۹۵ سے لے کر اب تک عورت کی امپاورمنٹ میں ''مردوں اور لڑکوں کا کردار'' کا موضوع مستقل شامل رکھا گیا ہے۔اس بار بھی اس عنوان سے کئی فورم مختلف سطحوں پر منعقد ہوتے رہے۔اجتماعی برائیوں سے لڑنے کے لیے مشترکہ جدوجہد کا راستہ زیادہ ثمر آور ہو سکتا ہے۔اور ہم مشرقی عورتوں سے بڑھ کر اس بات

کو کون سمجھے گا جن کے ہاں خود عورت ہی عورت کو جینے نہیں دیتی۔عورتوں کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں اگر وہ اپنی صنف سے دشمنی کا رویہ منصفانہ اور درست رویے سے بدل لیں (مگر پھر سٹار پلس کے ڈرامے کون دیکھے گا؟)۔یہ نکتہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ مشرقی معاشروں میں خاندان مضبوط ہے جس میں مرد کو سربراہ کی حیثیت حاصل ہے،لہٰذا یہاں مرد کے تعاون کے بغیر عورتوں کی بہتری کے منصوبے کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

دوسری طرف فیمینزم کا فکری ڈھانچہ خود جن تناقضات کا شکار ہے، وہ یواین کے ان ایجنڈوں میں بھی صاف دِکھتے ہیں۔حقوق کہاں فرائض کا روپ دھار لیتے ہیں،اور الٹا ظلم کا سبب بن جاتے ہیں، کس مقام پر مساوات کو ایک طرف رکھ کر عورت کی بہتری کے لیے عدل کا دامن تھامنا ہے، یعنی Equality اور Equity کی بحث۔عورتوں کو کیریئر میں اعلیٰ مقام اور فیملی لائف دونوں میں سے لامحالہ ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے، بے شک وقتی طور پر سہی۔چند سال پیشتر یو ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں ڈائریکٹر پالیسی پلاننگ، ڈاکٹر این میری سلاٹر کو اپنی ''ڈریم جوب'' سے استعفا دینے اور اعترافی بیان پر فیمنسٹ حلقوں سے بہت کچھ سننا پڑا۔اس کا کہنا تھا کہ میں اپنے ٹین ایج بیٹوں کو وہ پوری توجہ نہیں دے پا رہی جو ان کا حق ہے،اب میں ایک خوش باش عورت ہوں۔اس کے مضمون کو ایک ملین لوگوں نے پڑھا اور ان میں سے خواتین کی ۹۵ فیصد تعداد نے اس جرات اظہار پر اس کا شکریہ ادا کیا(۱)۔

پھر قحبہ گری کے بارے میں فیمینزم کا الجھا ہوٴا موقف۔سیڈا کی دفعہ ۶ فریق ریاستوں کو عورتوں کی خرید و فروخت، قحبہ گری اور استحصال کی حوصلہ شکنی کے لیے ضروری اقدامات اٹھانے کا پابند کرتی ہے۔یہ ایک اچھی شق ہے اور دنیا بھر میں اس حوالے سے پھیلے ہوئے جرائم کے سد باب میں مفید ہے۔البتہ قحبہ گری کے پیشے پر پابندی لگانا اس نکتے کا حصہ نہیں ہے کیونکہ یہ ان کے نزدیک بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔یعنی عورت اگر اپنی مرضی سے یہ پیشہ اختیار کرتی ہے تو یہ بالکل درست لیکن اگر مجبور ہو کر کرے تو ظلم۔اب مجبوری کی کیا تعریف ہے؟ جبکہ ہمارے ہاں یہ حال ہے کہ اگر کوئی عورت اس زندگی سے تائب ہو کر شرفا میں شامل ہونا چاہے تو ہمارا معاشرہ اس کو قبول ہی نہیں کرتا۔اس موضوع پر عملی مثالوں کے ساتھ ساتھ پاک و ہند کی بیشمار مقبول فلمیں بن چکی ہیں اور کئی ناول لکھے جا چکے ہیں۔تو کیا عورت کے لیے اس معاشرتی جبر کا سد باب کرنے کے لیے قانون سازی نہیں ہونی چاہیئے تا کہ اس کو بھی شریفانہ زندگی کا حق ملے؟اسی طرح ہالی وُڈ کی مووی ''پریٹی وومن'' میں جولیا رابرٹس کے مکالمے فکر انگیز ہیں جب وہ اپنی راتوں کی قیمت ادا کرنے والے کے سوال کا جواب دیتی ہے کہ وہ کس طرح تعلیم ادھوری چھوڑ کر اس پیشے میں آئی اور پھر ''مزدوری'' کی پہلی رات مسلسل روتی رہی۔سوال یہ ہے کہ جو معاشرتی عوامل ایک بھولی بھالی معصوم، امنگوں سے بھری لڑکی یا عورت کو اس طرف مائل کر دیں، کیا ان عوامل کا سد باب اس نکتے کا لازمی حصہ نہیں ہونا چاہیئے ؟ جنہیں مشرقی معاشروں میں عورت پر ہر بات میں معاشرتی جبر دکھائی دیتا ہے خواہ وہ اپنے گھر میں سکون سے بیٹھی ہو، وہ اس جبر کو کیسے نظر انداز کر دیتے ہیں؟اور اگر حالات سے مجبور ہو کر مزدوری کرنے والے بچوں کے لیے چائلڈ لیبر کی مناہی کا قانون بن سکتا ہے تو کیا ایسی عورتوں کے لیے قانون نہیں بننا چاہیئے؟ کیا طوائف کو سیکس ورکر کہہ دینے سے یہ حق تلفی امپاورمنٹ میں بدل جاتی ہے؟

خاص ہے ترکیب میں....

تیسری طرف ایسے عالمی منصوبوں کا ایک بہت بڑا پہلو مسلمان ممالک کے لیے مغرب اور یواین کے رویے ہیں۔اس وقت بہت سے مسلمان ممالک اس کنونشن کے دستخطی ہیں۔عورت کی حیثیت ایسا معاملہ ہے جس میں مشرق اور مغرب کے ماحول کا فرق سب سے زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔بیجنگ کے ابتدائی اجلاسوں میں مسلم ممالک خصوصاً مصر،

مراکش اور تیونس نے ویٹی کن اور خاندانی نظام کی حامی مغربی این جی اوز کے ساتھ مل کر اس ایجنڈے پر کئی اعتراضات اٹھائے تھے۔ اس بار بھی اردن کی مندوب نے مسلم معاشروں کے لیے بطورِ خاص ایکشن پلان بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ ایک دن سیشن کے بعد ہم نے متحدہ عرب امارات کے مندوب ڈاکٹر ابراہیم سے بات چیت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام یہ سب حقوق عورتوں کو دیتا ہے، ہمارا اختلاف بس وراثت اور شہادت پر ہے۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ پوچھتے مگر ہم حیران ضرور ہوئے کہ پورنو گرافی، قحبہ گری اور اسقاط کے ''حقوق'' کے باب میں آپ کیا فرمائیں گے!! انہوں نے اپنے ہاں خواتین کی ترقی کی بہت سی مثالیں بھی دیں اور اسلام کے دیے ہوئے حقوق عورتوں کو دلوانے کی ضرورت پر زور دیا۔

گڈ گورننس

حقیقت یہ ہے کہ اول تو ہماری عورت کے مسائل بہت مختلف ہیں۔ اور جو مسائل یکساں ہیں، ان کی وجوہات مختلف ہیں۔ اور اگر وجوہات ایک سی بھی ہیں تو وہ حل کے لیے مختلف ٹریٹمنٹ کی متقاضی ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں عورت کا سب سے بڑا مسئلہ غربت ہے، اور اس کا حل لازماً عورت کو ملازمت دینا نہیں بلکہ اس کے شوہر کو ملازمت دے کر بھی ہو سکتا ہے۔ اچھا طرزِ حکمرانی، آسان انصاف، بے روزگاری سے نجات، بدامنی کا خاتمہ، پینے کا صاف پانی، بنیادی صحت، تعلیم ....یہ سب ایک ترقی پذیر ملک کی اکثریتی آبادی کے مسائل ہیں۔ ان کے حل کے لیے ہمیں صنفی عینک لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مسائل بنیادی انسانی حقوق کے تحت حل ہونے چاہئیں۔

پھر ہماری عورتوں سمیت ساری آبادی کا مشترک مسئلہ استعمار کی باجگزار حکومتیں ہیں، جن کی ترجیحات میں عوام کی بھلائی کسی درجے میں اہمیت نہیں رکھتی اور کوئی مائی کا لال انہیں پوچھ بھی نہیں سکتا۔ ہمارے ہاں بھی حکومتوں کے احتساب کی روایت مضبوط ہونے دی جائے اور دنیا بھر سے مجرموں کے حمایتی مشکل وقت میں انہیں عوامی احتساب سے بچانے کے لیے نہ کود پڑتے ہوں، تو کیا ہمارے عوام کی حالت بھی بہتر نہ ہونے لگے؟ ہمارے دور دراز پسماندہ علاقوں میں عورت جانور سے بدتر زندگی گزارتی ہے، روایتی جکڑ بندیوں کا شکار ہے، اور ان علاقوں کے وڈیرے ہمارے سیاست کے بڑے نام ہیں، لڑکیوں پر تعلیم کے دروازے بند کرنے والے ہماری پارلیمنٹوں کی رونق ہیں، اور ان میں خواتین بھی شامل ہیں۔

دین سے استفادہ

دوسرا پہلو مذہب کے کردار کو نظر انداز کرنا ہے۔ اسلام اسلام کا شور بہت مچایا جاتا ہے مگر اسلام کی خوبصورتی سے استفادہ کرنے کے لیے اس کو اجتماعی نظام کا حصہ بنانے پر کوئی پیش رفت نہیں۔ معاشرتی اصلاح کے پروگراموں میں بھی خال خال عورتوں کے احترام اور ان کے حقوق کی ادائیگی کا تذکرہ سننے کو ملتا ہے۔ اچھے بھلے سمجھدار گھرانوں میں اکثر خود عورتوں کے حوالے سے روایتی سوچ پائی جاتی ہے۔ عورتوں کے سٹیٹس کے بارے میں مذہب اور روایت کو خلط ملط کرنا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اسلامی تحریکوں کا کردار بھی اس حوالے سے بہت قابلِ رشک نہیں ہے۔ این جی اوز کے اپنے مسائل ہیں۔ کانفرنس میں مختلف اسلامی ممالک کی این جی اوز موجود تھیں۔ انڈونیشیا کی ایک این جی او نے اپنے ایونٹ میں وہاں کے اسلامی قوانین کو عورتوں کی ترقی میں بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ ہال میں موجود مصر کی مندوب نے ہمت کر کے کہا کہ اسلام نے تو بہت سی جگہوں پر عورت کو بہت مضبوط کیا ہے، اس پر سب کو سانپ سونگھ گیا اور چند طنزیہ تاثرات اُبھرے۔

زیادہ تر مسلم ممالک کی طرح ہمارے ہاں بھی عورت کی امپاورمنٹ پر کام کرنے والوں کا مائنڈ سیٹ بیرونی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، اس بنا پر وہ اپنے مسائل کے مقامی حل تلاش کرنے سے قاصر ہیں اور ان کی طرف سے کی گئی عورتوں کے حقوق کی بات معاشرے میں قبولیت نہیں پاتی۔ بیجنگ کا تیسرا مرحلہ بیجنگ پلس ۱۰ کانفرنس ۲۰۰۵ میں ہوئی تھی جبکہ اسی سال کا گیلپ سروے جو بعد ازاں نیویارک ٹائمز میں

شائع ہوا، بتاتا ہے کہ مسلم ممالک کی خواتین خود کو ہرگز مظلوم (Oppressed) یا دوسرے درجے کا مقام قبول کرنے پر مجبور نہیں سمجھتیں۔ سروے میں شامل ہر ملک سے بھاری اکثریت میں عورتوں نے یہ بھی اقرار کیا کہ ان کے معاشروں کا بہترین پہلو اپنی اخلاقی اور روحانی اقدار اور مذہبی عقائد سے وابستگی ہے۔ گیلپ کی تجزیہ نگار کا کہنا تھا کہ مشرق میں عورتوں کی تقویت خطے میں امریکہ کے اہم مقاصد میں سے ہے، لیکن اس بارے میں کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر ہی کہ دراصل مسلمان عورتیں چاہتی کیا ہیں، وہ محض دلچسپی کی بنا پر سرگرم عمل ہے (۲)۔ اس کے مقابلے میں اگر مذہب کے Meta-narrative کے ذریعے ہمارے مسائل حل ہو سکتے ہیں تو یہ ہمارے لیے آسان تر اور زیادہ فطری راستہ ہونا چاہیئے۔

انسانیت قعرِ مذلت میں

یہ LGBT والا معاملہ بھی بے حد دلچسپ ہے۔ ہم نے تو اب آ کر تیسری صنف کو ووٹ کے قابل سمجھا، ورنہ اب تک وہ تفننِ طبع کا حوالہ ہی تھے۔ وہ بھی اپنی اس شناخت پر مطمئن اور ہم بھی خوش۔ مگر مغرب میں صنف کے معاملے میں پیدائشی انحراف والوں کو رویوں کے انحراف والوں کے ساتھ ملا کر ایک کلب بنا دیا گیا ہے اور ان کے جنسی حقوق کے لیے جدوجہد زوروں پر ہے۔ الہامی مذاہب کے اثرات کی بنا پر جدید دنیا میں بیسویں صدی کے آغاز تک ہم جنس پرستی کو ایک معاشرتی برائی سمجھا جاتا تھا اور یہ ایک قابلِ سزا عمل تھا۔ ۱۸۹۵ میں مشہور ڈرامہ نگار آسکر وائلڈ کے مقدمے نے یورپ اور امریکہ میں بے حد شہرت پائی تھی۔ پھر ترقی یافتہ قوموں کو احساس ہوا کہ ہم شاید انسانیت کو کسی بہت بڑی خیر سے محروم رکھے ہوئے ہیں۔ لہٰذا رفتہ رفتہ پہلے اس کے لیے معاشرے میں قبولیت پیدا کی گئی، پھر ایک طویل جدوجہد کے بعد اس کو جرم قرار دینے والے قوانین سے چھٹکارا حاصل کیا گیا۔ امریکہ میں یہ سلسلہ ۲۰۰۳ تک مکمل ہوا۔ اس کے باوجود ایسے لوگوں کو اسّی کی دہائی کے آغاز تک جسمانی یا نفسیاتی مریض کے زمرے میں رکھا جاتا تھا بلکہ امریکی نفسیات دانوں کے نزدیک یہ آج بھی صنفی شناخت کی خرابی پر مبنی رویہ ہے۔ پھر برطانیہ میں پہلی بار ۱۹۸۵ میں اور امریکہ میں ۱۹۹۰ میں ان پر ٹی وی شوز (soaps) چلانے کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد شور مچنے کے باوجود اس سلسلے نے رکنے کا نام نہیں لیا (۳) یہاں تک کہ میڈیا کی برکات سے آج یہ مغرب میں نہ صرف لائف سٹائل ہے، بلکہ اس طرزِ زندگی کی حمایت کرنا آپ کے موڈرن اور روشن خیال ہونے کی علامت بن گیا ہے۔

پھر اکیسویں صدی خاندان کی نئی تشریح لے کر آئی۔ ہم جنس پرستوں کی ''خاندانی زندگی'' پر تحقیق ہونے لگی۔ ایک حالیہ سروے میں نصف سے کچھ زیادہ امریکی یک صنفی ''شادی'' کو قانونی حیثیت دینے کی حمایت کرتے ہیں۔ جبکہ مخالفت کرنے والوں کی اکثریت اسے مذہبی اور اخلاقی بنیادوں پر غلط اور خاندانی نظام کی جڑیں کاٹنے کے مترادف سمجھتی ہے (۴) (حال ہی میں امریکہ میں یک صنفی شادی کو قانونی حیثیت دے دی گئی ہے)۔ براعظم یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا کے تقریباً تمام ملکوں میں یہ اجازت اب تک مل چکی ہے۔ البتہ گزشتہ دنوں جاپان کے وزیر اعظم نے جن کا تعلق لبرل پارٹی سے ہے، اپنے ملک میں اس تقاضے پر خاصی برہمی کا اظہار کیا اور اسے اپنے سماجی نظام کے لیے خطرہ کہا، جس پر انہیں میڈیا کی طرف سے قدامت پرستی کا طعنہ ملا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم جنس پرستی کو ایک نارمل بلکہ پسندیدہ عمل سمجھنے کے اس رجحان نے جدید مغربی معاشرے کو تمام تر جدت پسندی کے باوجود قدیم عذاب یافتہ قوموں کے زمانے سے جوڑ دیا ہے۔

چراغ تلے!

سیشن کے دوران وقفوں میں خوب رونق رہتی۔ کیفے بھی آباد رہتے اور لابیز میں آتے جاتے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ برطانیہ والوں سے ہم نے عرض کی کہ جناب، ہم تو ٹھہرے بیک ورڈ، جتنے مسائل ہوں اتنے کم ہیں، مگر آپ ایک جدید سوسائٹی ہیں آپ کے ہاں عورت کے کیا مسائل ہیں؟ کہنے لگے بس وہی......امتیازی

رویے، گھریلو تشدد وغیرہ وغیرہ ......ہم نے کہا یہ تو ہمارے ہاں کے مسائل ہیں۔ بولے، ویل، مسائل تو ہر جگہ ایک سے ہی ہیں .....ہم نے کہا بجا فرمایا مگر وجوہات اور پس منظر مختلف ہیں، تو آپ کے ہاں کیا وجوہات ہیں؟ اور پچھلے بیس سال میں کیا پیش رفت ہوئی ہے، کوئی موٹی سی بات بتا دیں۔ وہ شاید اس سوال کے لیے تیار نہ تھے، کہنے لگے، ام ....اس کا جواب بہت پیچیدہ ہے، یوں بتانا آسان نہیں۔ ہم مسکرا کر رہ گئے۔

اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ ترقی یافتہ مما لک میں تمامتر کوششوں کے باوجود ابھی تک خواتین کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کی شرح بہت کم ہے۔تعلیم، خوشحالی اور قوانین کے باوجود گھریلو تشدد کی شرح خوفناک ہے۔ ہماری عورتیں تو شوہر کا ہی ظلم سہتی ہیں، یہاں ساتھ بوائے فرینڈ والا ''رولا'' بھی ہے، کھایا نہ پیا، گلاس توڑا بارہ آنے ......شوہر تو جیسا تیسا ہو، تحفظ بھی دیتا ہوگا اور قانوناً اخراجات اور اولاد کی پرورش کا پابند بھی ہوگا، بوائے فرینڈ کی مار کیا سوچ کر ہضم ہوتی ہوگی؟ سکولوں میں بچوں کو ہر طرح کی سیکس ایجوکیشن دینے کے باوجود، جو یو این پروگرام کا لازمی نکتہ ہے، وہاں ٹین ایج پریگنینسیز کی شرح کنٹرول ہونے میں نہیں آ رہی۔ نصف سے زیادہ شادیاں طلاق پر منتج ہو رہی ہیں، سنگل پیرنٹ اولاد ایک معمول کا منظر ہے......مغرب کی عورت کی مسیحائی کون کرے گا؟

عمارت کی طویل لابی میں تصویری نمائش تھی، آغاز میں کمزوردل افراد کے لیے تنبیہہ کے ساتھ ....نمائش کیا تھی، امت کے زخموں کا تماشا لگا تھا، شام کی حکومت کے ہاتھوں اپنے ہی شہریوں کے ادھیڑے ہوئے جسم ....اور اس نمائش میں تعاون کرنے والوں میں یورپی مما لک کے ساتھ کچھ اسلامی ملکوں کے نام بھی تھے۔ میں سوچتی رہی، اس کی جگہ روہنگیا مسلمانوں کی لاشوں کے انبار بھی دکھائے جا سکتے تھے، مگر شاید ان کے لیے اسلامی ملکوں کا تعاون نہیں ملا!!

(جاری ہے)

☆......☆......☆

ہلکا پھلکا
دوسرا اور آخری حصہ

محمد صفدر بشیر

خطہِ لاہور

تیرے بسیار خوروں کو سلام

نان چنے المعروف نان چھولے

ماضی میں بطور ناشتہ یہ کچھ ایسا زیادہ مرغوب ناشتہ نہ تھا۔ ہمارے لڑکپن میں بالعموم منٹو پارک (موجودہ یادگارِ پاکستان) کے وسیع گراؤنڈز میں کرکٹ میچ کھیلنے اور دیکھنے والے شائقین یا پھر آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے آنے والے فلمی یونٹ کے ارکان نان چھولے بطور لنچ کھا کر گزارہ کیا کرتے تھے۔ اُس دور میں نان چھولے بطور ناشتہ تصور تک نہ تھا۔ اللہ کی شان ہے کہ اب لاہوریوں اور گھوڑوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ پہلے تانگوں کے کوچوان (کوچبان) گھوڑوں کے آگے چنے کا تھیلا ڈال دیتے تھے اب لاہوریے چنوں کے آگے بچھے چلے جاتے ہیں اور چنوں کے لئے بڑے فخر سے ''ہارس پاور'' HORSE POWER کی اصطلاح استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ جسمانی طاقت کے معاملے میں گھوڑے کے علاوہ ان کا کوئی مد مقابل نہیں۔ چنانچہ کہنے والے عوام اور چنوں کو طاقت کا سرچشمہ کہتے ہیں۔

لاہوریوں کے اس مرغوب ناشتہ میں اب بڑی تیزی سے مرغ بھی اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ کچھ لوگ ''مرغ چنے'' کے ناشتے کو محض نان چنے کے ناشتہ کی ترقی یافتہ شکل (IMPROVED FORM) سے تعبیر کرتے ہیں، جبکہ مرغ کو محبوب رکھنے والے دوسرے مکتبۂ فکر کے بزرگ اس ناشتہ کو مرغ کی غایت درجہ بے حرمتی گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک مرغ کا مقام بہت بلند ہے۔ بقول ان کے کسی دور میں مرغ ایک نہایت قیمتی اور مقدس چیز سمجھی جاتی تھی کہ جسے محض دو مواقع پر ہی ذبح کر کے تناول فرمایا جاتا تھا ایک تو جب مرغ بذاتِ خود بیمار ہو اور بچنے کی امید نہ رہی ہو یا پھر جب کھاتے پیتے گھرانے کا کوئی فرد بیمار پڑ جائے اور اطباء اُسے مرغ کی یخنی پینے کا مشورہ دیں۔ ویسے یہ بھی حقیقت ہے غریب غرباء حکیم صاحب کی ہدایت کے مطابق مرغ کے شوربہ کا کام ''کالے چنوں'' کے شوربہ سے ہی چلا لیا کرتے تھے اور صحت یاب بھی ہو جاتے تھے۔

کچھ بزرگوار ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو لاہوریوں کی چنوں سے غایت درجہ رغبت کو حضرت آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے والے واقعہ سے منسوب کرنے سے بھی نہیں چوکتے اور سینہ ٹھونک کر کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ نے جنت میں گندم کا دانہ نہیں بلکہ چنے کا دانہ کھایا تھا۔

نان چنوں کے ناشتہ کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ سہولت بھی ہے کہ اس ناشتہ کے حصول کے لئے حلوہ پوری اور لسی کلچہ کے ناشتہ کی طرح مخصوص دکانوں پر ہی جا کر خریدنا نہیں پڑتا بلکہ یہ موبائل دوکانوں پر بھی مل جاتا ہے۔ ان موبائل دوکانوں کو عرف عام میں ریڑھی یا ٹھیلہ کہا جاتا ہے بلاشبہ یہ موبائل دوکانیں ''انصاف گھر کی دہلیز پر'' پہنچانے کے بلند بانگ دعوے کرنے والے سیاستدانوں کے برعکس عملاً گھر کی دہلیز کے قریب تک نان چنے ضرور پہنچا دیتی ہیں۔

ان موبائل دکانوں اور ''ریگولر'' باقاعدہ دکانوں میں ایک معمولی سا فرق ضرور ہوتا ہے۔ موبائل دکانوں میں ''نانوں'' کو زمانے کی سرد و گرم ہوا لگنے سے بچانے کے لئے انہیں ایسے شیشے کے گھر میں رکھا جاتا ہے کہ جس کے آر پار دیکھنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ یقیناً یہ شیشے کا گھر کبھی شفاف رہا ہو گا جس کے شیشوں کے اندھا کرنے کے لئے میل کچیل کا خصوصی اہتمام نظر آتا ہے۔ غالباً یہ اہتمام شیشے کے گھر میں محبوس نانوں کو کسی منچلے کی نظر بد یا پتھر سے بچانے کے لئے کیا جاتا ہے۔

اس موبائل دوکان یعنی ٹھیلے کے ایک کونے پر ایک تولیہ بھی لٹکا ہوتا ہے یہ خصوصی سہولت ''ایٹ دی سپاٹ'' ناشتہ کرنے والے معزز گاہکوں کے لئے ہوتی ہے۔ یہ تولیہ ان کے ہاتھوں کو خشک کرنے کی بجائے گیلا کرتا ہے۔

اس موبائل دکان میں سارا کام ''آٹو میٹک'' ہوتا ہے۔ ٹھیلے کے دوسرے کونے پر اپنا قد بڑھانے کے شوقین طالبعلم کی طرح ایک ''ڈش واشر'' لٹکا ہوتا ہے جسے عرف عام میں پانی کی بالٹی کہا جاتا ہے۔ ''ایٹ دی سپاٹ'' ناشتہ کرنے والا معزز گاہک، ناشتہ تناول فرمانے کے بعد از خود ہی اپنی پلیٹ بالٹی میں غرقاب کر دیتا ہے، جسے دوکاندار کا کارندہ جو بالعموم ''چھوٹے'' کے نام وعنوان سے پہچانا جاتا ہے، میکانکی انداز میں بالٹی سے نکال کر ایک ایسے گیلے کپڑے سے کہ جس کا اصلی رنگ جاننے کے لئے محض قیاس آرائی سے ہی کام لیا جا سکتا ہے، پونچھ کر پلیٹوں کے اُس کالم میں جمع کر دیتا ہے جو نئے گاہکوں کے کام آتی ہیں۔

کچھ کم فہم اور لاعلم قسم کے لوگ اس موبائل دوکان کے مالک کو ایک عام سا ٹھیلے والا سمجھتے ہیں مگر جب ان پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس عام سے ٹھیلے والے کی دو کوٹھیاں شہر کے پوش علاقے میں معقول کرایہ پر اٹھی ہوئی ہیں اور بچے مہنگے سے پرائیویٹ اسکول میں زیر تعلیم ہیں تو وہ بھی ملازمت چھوڑ کر ایسا ہی ٹھیلہ لگانے پر غور کرنے لگ جاتے ہیں۔

سری پائے کا ناشتہ

یوں تو سری پائے کے ناشتے کا شمار بھی لاہوریوں کے قدیم ناشتوں میں کیا جا سکتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس ناشتے کو ماضی بعید میں وہ پذیرائی حاصل نہ تھی جو آج کل ہے۔ جب سے حکمران طبقہ کی اس ناشتے پر نظر عنایت ہوئی ہے اس کے تو دن ہی بدل گئے ہیں۔ اس کی قدرو منزلت میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔

ماضی قریب میں تو کچھ حکمرانوں کی پہچان ہی سری پائے کا ناشتہ بن گئی تھی۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ حکمرانوں کا ذکر سری پائے کا ناشتہ کے بغیر اور سری پائے کا ذکر حکمرانوں کے بغیر ادھورا سا لگتا تھا۔

اگرچہ اس ناشتے کو محض ایک نظر دیکھ لینے ہی سے مغربی ممالک کے باشندوں کا کولیسٹرول ایک دم ہائی ہو جاتا ہے۔ تاہم اس کے شیدائی بڑے بڑے پائے کے بزرگ بھی پائے گئے ہیں ایسے احتیاط پسند بزرگ بھی دیکھے گئے ہیں جو جیب میں کولیسٹرول کم کرنے کی گولیاں رکھ کر ناشتہ کرتے ہیں۔

کچھ حاسد قسم کے لوگ اس ناشتے کو ''ام الامراض قلب'' سمجھتے ہیں اور شائقین کو ہارٹ اٹیک کا سب سے بڑا سبب کہہ کر اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور اس شاہی ٹائپ ناشتے کی قدر افزائی کرنے کی بجائے ناشتہ کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کرتے رہتے ہیں۔ سازشی عناصر کی ان تمام کوششوں کے باوجود اس کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

اس ناشتے کا شمار مہنگے قسم کے ناشتوں میں ہوتا ہے۔ تاہم ناشتے کی ان دکانوں پر بھی رش کسی طور پر ناشتہ کی دیگر اقسام کی دوکانوں سے کم نہیں ہوتا۔

ناشتہ کی ان دوکانوں پر رش کو مدنظر رکھ کر حکومت بڑے دھڑلے سے کہتی ہے کہ جس قوم کے ہر فرد کے ایک ہاتھ میں موبائل اور دوسرے ہاتھ میں کشکول کی بجائے سری پائے کا ڈونگا ہو وہ قوم غریب کیسے ہو سکتی ہے! چنانچہ قوم کے دوسرے ہاتھ میں کشکول دیکھنے کے لئے حکومت اعلانیہ اور غیر اعلانیہ ٹیکس لگاتی رہتی ہے۔

اس ناشتہ کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لاہوریوں کے نزدیک بکرا کس قدر انمول چیز ہے۔ بکرے کی اس سے زیادہ قدر افزائی اور کیا ہوگی کہ عوام اس کی اوجھڑی تک کھانے سے دریغ نہیں کرتی۔ سری پایا تو پھر پائے کی چیز ہے۔ اگر چمڑے کی صنعت کو فروغ حاصل نہ ہوا ہوتا تو کچھ عجب نہ تھا کہ لاہوریے بکرے اور دنبے کی کھال کھانے کا بھی کوئی نہ کوئی فارمولا ایجاد کر ڈالتے۔

بظاہر سری پائے کا ناشتہ بکرے کی سری اور پایوں پر مشتمل ہوتا ہے مگر بہ باطن اس میں کیا کیا کچھ ہوتا ہے یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے یا پھر

دوکاندار......! بلکہ بعض اوقات تو دوکاندار بھی نہیں جانتا (جب دیگچے پر ڈھکن صحیح طور پر نہ رکھا گیا ہو) دروغ برگردن راوی ایک واقف کار نے بتایا کہ سری پائے کی ایک معروف دکان پر ایک نوعمر لڑکا گھر سے سری پائے کا ناشتہ خریدنے کے لئے آیا۔ جب کافی دیر بعد اُس کی باری آئی اور اس کو اپنا ڈونگا ملا تو اس نے ڈونگے کا ڈھکن اٹھا کر دیکھنا چاہا کہ اس کی من پسند بوٹی ''کھد'' (اردو کا لفظ خدوخال غالباً اس لفظ سے ہی نکلا ہے) موجود ہے یا نہیں۔ ڈھکن اٹھاتے ہی وہ چیخ اٹھا۔

''پاھ چھجے......اوئے ایہہ کیہ اے......اوچوئی!!''

(پاھ چھجے یہ کیا؟ ارے اس میں تو چوہیا ہے)

پاھ چھجا برسہا برس سے یہ دکان چلا رہا تھا۔ اُس نے کمال پھرتی سے وہ ڈونگا لڑکے کے ہاتھ سے لیا اور بغیر کسی قسم کی بحث وتکرار وہ ''چیز'' تمام گاہکوں کے سامنے اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''کدی سری پاوے کھادے وی نے...... پاغل نہ ہوئے تے۔ ایہہ ہوئی تے بوٹی کھان والی ہوندی اے......''

(کبھی سری پائے کھائے بھی ہیں...... پگلا کہیں کا۔ یہی تو لذیذ بوٹی کھانے کے لائق ہوتی ہے)۔

پھر اُس نے لڑکے کے ڈونگے میں ایک اور بڑی سی بوٹی ڈال دی اور وہ لڑکا خوشی خوشی چلا گیا۔

پاھ چھجے کے اس فوری ردعمل کو دیکھ کر جہاں کچھ لوگوں کو اُبکائی سی آئی تو وہاں کچھ گاہکوں نے اسے دوکان کی ''نیک نامی'' (Good Will) قائم رکھنے کی بہترین کوشش بھی قرار دیا۔

نہاری کا ناشتہ

سچی بات تو یہ ہے کہ ناشتے کی اس صنف سے لاہوریے قطعاً آگاہ نہ تھے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد جب بھارتی مسلمان ہجرت کر کے یہاں آئے تو اپنے ہمراہ پان بیڑی کے ساتھ ساتھ یہ سوغات بھی لے کر آئے۔

فطری طور پر دودھ دہی مکھن کے دلدادہ لاہوریوں کا یہ مرغوب ناشتہ نہ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ دہلی کی نہاری لاہوری سری پائے کے ناشتے کی حریف ثابت ہوئی۔ شروع شروع میں سری پائے کے مقابلے میں کم قیمت ہونے کی بنا پر اس نے لاہوری ناشتوں میں جگہ پائی۔ پھر اپنے ''لوازمات'' کی بنا پر اس کا استعمال بطور فیشن بڑھا۔ اور اب عالم یہ ہے کہ لاہوریوں کو اس کی کچھ ایسی ''لت'' پڑ گئی ہے کہ معروف دوکانوں پر شائقین ایڈوانس بکنگ کے طور پر رات ہی کو اپنے برتن لائن میں لگا جاتے ہیں اور صبح منہ مانگی قیمت ادا کر کے گوہر مقصود پاتے ہیں۔ اس سے ناشتے کی اس صنف کی اہل لاہور میں مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تاہم کچھ بقراط صفت نفاست پسند حضرات اس عظیم الشان ناشتے کے ذائقہ سے محض اس بنا پر محروم ہیں کہ وہ ابھی تک یہ گتھی نہیں سلجھا پائے کہ نہاری پکانے میں استعمال ہونے والی زمین میں گڑی دیگ کو مانجھا، دھویا اور قلعی کس طرح کیا جاتا ہے۔

نہاری بالعموم تندوری روٹی کے ساتھ تناول کی جاتی ہے تاہم روغنی نان کے ساتھ تناول فرمانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

قتلمہ کا ناشتہ

عجیب وغریب نام رکھنے والی اس شے کے مصدر و ماخذ کا راقم کو تو کچھ علم نہیں۔ یہ جاننے کے لئے کسی ایسے خودساختہ دانشور نما ٹی وی اینکر سے رجوع کرنا پڑے گا جو انسائیکلوپیڈیا سے الفاظ نقل کر کے ناظرین کے درست تلفظ کو بگاڑ کر اپنی دانشوری کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔

یہ بات بہرحال طے ہے کہ قتلمہ لفظ کا قتل وغارت سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ کم وبیش نصف میٹر قطر کی خوش رنگ گول روٹی ہوتی ہے جو نہ جانے کس قسم کے غیر معروف آئل میں تلی جاتی ہے۔ اگرچہ اس پر بھرپور قسم کی TOPPING تو نہیں ہوتی تاہم اس کا سلسلہ نسب اٹالین پزا سے جوڑنے پر بہت سے ماہرین علم الانساب متفق نظر آتے ہیں اس چیز کے شوقین حضرات اسے جبڑوں کی ورزش کے لئے نہایت کارآمد شے قرار دیتے ہیں۔

خالص میدہ اور ناقص آئل سے تیار کردہ یہ چیز کھانے والے اپنے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں اسے تناول فرمانے کے بعد قبض کشا

گولیاں کھاتے دیکھے گئے ہیں۔

ہمارے لڑکپن میں یہ چیز میلوں ٹھیلوں کے موقعوں پر ''موت کے کنویں'' اور ''ان لکی'' ایرانی سرکس کے پنڈال کے باہر با آسانی دستیاب ہوتی تھی جس پر مصالحے کی ہلکی تہہ کے ساتھ ساتھ گرد وغبار کی تہہ اس کے لطف کو دوآتشہ کر دیتی تھی۔معلوم ہوتا ہے اب کسی سازش یا سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کچھ اونچے درجے کے مہنگے ریستورانوں نے اسے با قاعدہ اپنے ناشتے کے MENU میں شامل کر لیا ہے جہاں تک اب ہر کس و ناکس کی پہنچ نہیں۔

صبح دم کئے جانے والے ناشتوں کی کچھ اور بھی اقسام ہیں جن سے سر دست قلت وقت و صفحات کی بنا پر صرف نظر کیا جا رہا ہے۔

اکثر لاہوریے ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ کرنے کو ''بدعت'' خیال کرتے ہیں اور برملا یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ جو لطف زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنے اور ناشتہ کرنے میں ہے وہ بھلا انگریزی اسٹائیل میں ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ کرنے میں کہاں۔ جو پہلوان ٹائپ بزرگ آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کے بعد اٹھنے کے لئے کسی سہارے کے محتاط ہوتے ہیں وہ بھی چار پائی کے خلاصہ (پیڑھی) پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

بشرط صحت و زندگی زندہ دلان لاہور کے مشاغل سے بھی قارئین کرام کو آگاہ کیا جائے گا۔انشاءاللہ۔

☆......☆......☆

افشاں نوید

آؤ زندگی کا نصاب بدلیں!

تتلیوں کی طرح پھولوں پر بیٹھنا سیکھیں تو سماج شہد کی خوشبو اور تاثیر سے معطر ہو جائے گا

''انسان کے خمیر میں شاید کچھ غلط چیز گوندھ دی گئی ورنہ وہ فطرتاً اتنا شقی القلب تو نہ تھا! اتنا ماہر دھوکہ ساز، جعل ساز......

ہاں میں بتاؤں! انسان میں گدھے کی آمیزش کر دی گئی ہے۔

جیسے پسی مرچوں میں سرخ اینٹوں کا چورا ملا دیا، دھنیے میں لکڑی کا برادہ ملا دیا۔ جانوروں کی بجائے درختوں سے دودھ حاصل کیا جانے گا، دو اور تین نمبری دوائیں اور انجکشن، ذبح خانوں پر چھاپے پڑے تو گائے، بیل کی جگہ گدھے ذبح ہوتے پائے گئے اور تو اور کتوں کا گوشت مٹن کہہ کر فروخت کیا جا رہا ہے...... پنجاب میں کتنے چھاپے پڑے ہیں ......بیکریوں پر چھاپے پڑے تو پتہ چلا کہ اسپرنگ رول میں نجانے کیا کیا بھرا جا رہا ہے۔

ملک جہنم بن چکا ہے...... برسوں سے برین ڈرین جاری ہے۔ نوجوان نسل ملک میں رہنے پر تیار ہی نہیں ......لعنت ہے اس سسٹم پر......سو بار لعنت جہاں سیلاب اور زلزلہ زدگان کے لئے آئی ہوئی مدد پر بھی وزیر اور سفیر قبضہ کر لیتے ہوں...... وزیروں کی آمد پر جعلی خیمے لگائے جاتے ہوں انکے جاتے ہی لپیٹ دیئے جاتے ہوں...... بڑے سے بڑے مجرم کو بھی سزا نہ ملتی ہو۔ بڑے لوگوں نے اربوں روپے ہڑپ کئے کبھی کسی کا پیٹ چیر کر وہ دولت نہ نکلوائی گئی ہو......

اوپر سے نیچے تک زوال ہی زوال ...... ہر ادارہ تنزلی کی طرف گامزن کہ مچھلی سر سے سڑتی ہے جب اعلیٰ حکام ہی بنکوں کو لوٹ کر دیار غیر میں جائیدادیں بنانے میں لگ جائیں اور بنیادی ضروریات زندگی کے لئے عوام ترستی رہے اس ملک پر ایسے ہی زمینی، آسمانی عذاب نازل ہوتے ہیں۔''

میں ٹی وی کے ایک ٹاک شو میں یہ گفتگو سنتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ پاکستان کی برائیاں گنوانے، کمزوریاں بیان کرنے اور نظام کی خرابیاں تلاش کرنے میں ہم سب ہی گوگل، کی مانند ہیں، ہم ایک سکینڈ میں جو پاکستان کی برائیاں گنوانا شروع کرتے ہیں تو وہ فہرست اتنی طویل ہوتی ہے کہ جب تک سوئچ آف نہ کریں اوراق الٹتے ہی رہتے ہیں۔

ایک کسی اخبار کا سرورق دیکھ لیں۔ آپکا ناشتہ نوزیا کی نذر ہو جاتا ہے۔ وہی بم بلاسٹ، وہی حادثات، وہی لاشیں، وہی خون، وہی سسٹم کی خرابیاں، ٹی وی کھولیں تو سیاست دان نظام کی خرابیاں گنواتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ایک دوسرے کے گریبان پر ہاتھ ڈالنا اور زندگی کی مشکلات کا یوں ذکر کرتے ہیں گویا ہم آکسیجن بھی پیسے دے کر خریدتے ہیں اور اس کے سلینڈر بھی آئے دن مہنگے ہو رہے ہیں۔!

حقیقت کی نظر سے دیکھیں تو اسی ملک نے لاکھوں لوگوں کی قسمت بدلی ہے صرف معیار زندگی ہی دیکھ لیں اس ملک میں تین یا چار عشرے پہلے کا تو آپکو زمین اور آسمان کا فرق نظر آتا ہے پہلے محلے میں دو چار گھروں میں موٹر سائیکلیں ہوتی تھیں آج ہر متوسط آدمی کے پاس کار ہوتی ہے۔ ہمارے بچپن میں خاندان کے بزرگ حج کا عمرہ کرنے جاتے تھے آج خاندان کے خاندان یہ سعادت حاصل کرتے ہیں۔ اس وقت مرغی، جب گھر میں مہمان آتا تھا یا کوئی بیمار ہوتا تھا جب پکتی تھی آج بچے مرغی کھا کھا کر بور ہو چکے ہیں۔ اس وقت عید اور بقرعید پر کپڑے بنتے تھے جو ہم سارا سال پہنتے تھے اور بڑے بچوں کے کپڑے کاٹ کر چھوٹے بچوں کے بنائے جاتے تھے۔ گھروں میں ماسیوں کا کوئی رجحان عام نہ تھا۔

کسی کی شادی ہوتی تو محلے بھر میں سلائیاں اور ٹکائیاں شروع ہو جاتیں، سہیلیاں ایک دوسرے کو مہندی لگاتیں اور دلہن بناتیں۔ آج

دلہن کی مہندی ہمارے شہر میں دس ہزار روپے میں لگتی ہے اور دلہن بیوٹی پارلر سے پچاس ہزار روپے میں تیار ہوتی ہے۔ اس وقت دلہن کو بنارسی غرارہ یا ساٹن کے سرخ غرارے پر گوٹے، تلے کا کام، دوپٹے پر چوڑی سی بیل سنہرے رنگ کی ...... یا دوپٹے پر کام بھی کرالیا جاتا تھا، اور باقی کپڑے سلتے بھی گھر میں تھے اور ٹکتے بھی۔ لڑکیاں میٹرک پاس کرتی تھیں تو انکے جہیز کے جوڑے اور چادروں پر ایپلک کے کام یا چارسوسی کی چادریں جن پر باریک کڑھائیاں ہوتی تھیں، لڑکیوں کی مائیں، بہنیں، بھاوجیں سب جہیز کی تیاری میں مصروف ہو جاتیں۔ ان سلائیوں کڑھائیوں میں ہر ٹانکے کے ساتھ محبتیں اور دعائیں بھی ٹانکی جاتیں۔ اب خواب وخیال ہوئیں وہ محبتیں اور وہ وقت...... اب شاید گاؤں دیہاتوں میں ہوتا ہو تو ہوتا ہو، شہروں کا مزاج لگ بھگ یکساں ہوتا ہے۔ اب صرف جیب میں پیسہ ہونا شرط ہے ہر چیز بازار میں دستیاب ہے۔ اور منہ مانگے داموں ہم خرید رہے ہیں۔ پھر بھی ہم کہتے ہیں کہ پاکستان نے ہمیں دیا کیا ہے؟ حالات بدتر سے بدتر ہو رہے ہیں۔

صرف دو عشرے پہلے کے میعار زندگی سے آج کا مقابلہ کرلیں تو حیرت ہوتی ہے کہ لوگوں کا معیار زندگی کتنا بہتر ہوا ہے۔ آج گھر میں جتنے بچے ہیں ہر بچے کا الگ موبائل ہے۔ موبائل نہیں آج متوسط طبقے کے ہر بچے کے پاس اینڈرائڈ ہے۔ ہر ایک کے پاس الگ الگ لیپ ٹاپ ہے۔ آج کے بچے ایک لباس دوسری تقریب میں پہننا پسند نہیں کرتے کہ فلاں فلاں نے میرے یہ کپڑے دیکھے ہوئے ہیں۔ آج ہر عمر کی بچیاں بیوٹی پارلر لازمی جاتی ہیں ٹیلر ماسٹر کے پاس لازمی جاتی ہیں۔ دوستوں کی پارٹی میں حلیم اور بریانی کی جگہ پیزا اور لزانیہ ہوتا ہے۔ یوں ہی تو نہیں KFC اور میکڈونلڈ کی برانچیں کھلی چلی جا رہی ہیں۔ یونہی تو بیوٹی پارلرز کے نرخ اتنے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ یونہی تو نہیں ڈھائی سال کا بچہ اسکول جا رہا ہے جس کی ماہانہ فیس پندرہ سے پچیس ہزار روپے ہے جب ہم اسکول جاتے تھے اس وقت پانچ برس کے بچے اسکول جاتے تھے۔ آج گلی محلوں میں مونٹیسریوں کے جال بچھے ہوئے ہیں اور جتنی چھوٹی کلاس ہوتی ہے اتنی بڑی فیس ہوتی ہے۔ نرسری کلاسوں کی فیسیں سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔

آج سے تین دہائیاں قبل بھی اسکول ''اسٹیٹس سمبل'' نہیں بنے تھے۔ آج آپ کا بچہ کس اسکول میں پڑھتا ہے یہ آپ کا تشخص جاننے کے لئے اہم ترین سوال ہے۔ مریض کا آپریشن کس ہسپتال میں ہوا یا بیٹی بہو کی ڈلیوری کس ہسپتال میں۔ یہ سماج میں تشخص کو ناپنے کے پیمانے ہیں۔ دلہن کہاں سے تیار ہوئی اس سوال میں بہت سا تجسس چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اور صرف اپنی انا اور خاندانی وقار کو آنچ نہ آجائے لوگ مقروض ہو جاتے ہیں وسائل مہیا کرتے کرتے ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں......

طلب اور رسد کا ایک قانون ہے علم معاشیات میں۔ ہماری طلب کے مطابق رسد پیدا کی جاتی ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ ہماری طلب بھی اب حقیقتاً ہماری طلب نہیں ہے، یہ مصنوعی پیدا کی گئی طلب ہے۔ بقول اشفاق احمد مرحوم کہ ''صرف راشن کی لسٹ پر نظر ڈال لیں کتنی ایسی اشیاء ہیں جن کے نام تک ہم دو دہائی پہلے نہ جانتے تھے اب ہماری اولین ضرورت ہیں۔'' ہاں بات تو درست ہے پہلے باتھ روم میں ایک صابن کی ٹکیہ ہر ضرورت کو کافی ہوتی تھی اب فیس واش الگ ہے، ہینڈ واش الگ، ماؤتھ واش الگ ہے، ٹوتھ پیسٹ ہر ایک کا الگ، شیمپو گھر کا ہر فرد الگ استعمال کرتا ہے کیونکہ کسی کے بالوں کی ضرورت کچھ ہے کسی کی کچھ، شیمپو بھی ناکافی ہے کنڈیشنر بھی لازم ہے۔ اب وہ انڈا، دہی، مہندی، ابٹن، نہار منہ عناب (رات کے بھگیے ہوئے) کھانا۔ سب حسن اور بالوں کی افزائش کے ٹوٹکے صرف کتابوں میں لکھے ہیں اطباء کی۔ اب ہر چیز ریڈی میڈ دستیاب ہے ماؤں کو بتادیا گیا کہ پیمپرز کے بغیر بچوں کی نشوونما متاثر ہوگی، گائے کے اور بھینس کے دودھ سے ساری مہلک بیماریاں پھیلتی ہیں لہٰذا ہم مہنگے داموں ٹیٹرا پیک خریدتے ہیں۔

اگر کوئی ایسا ہم وطن جو پچاس برس قبل دنیا سے رخصت ہوا ہو آج کے پاکستان میں واپس آئے تو ایک متوسط خاندان کے طرز بود و باش کو دیکھے وہ اس قدر حیران ہوگا کہ شاید اصحاب کہف کی طرح دوبارہ قبر جا کر آنکھیں بند کرنا پسند کرلے۔

اب تک کی تحریر کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ ہم کہیں کہ ''لوٹ پیچھے کی

طرف اے گردشِ ایام تو'' سادہ سی بات یہ ہے کہ ہم ترقی کا سفر طے کر رہے ہیں، ہماری معیشت، ہمارا طرزِ بودو باش، ہماری اقدار و روایات سب تبدیل ہو رہی ہیں۔ اگر مثبت سمت میں تبدیل نہ ہوتیں تو ہم جمود کا شکار ہو جاتے اور جمود کا شکار معاشروں کو مارنے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خود ہی اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔

ہمارے پاس جو بھی وسائل ہیں اس ملک کے عطا کردہ ہیں، ہمیں ترقی اور نشوونما کے جو مواقع عطا کئے ہیں اس ملک نے کیے ہیں۔ آج ہمارا معیارِ زندگی ہمارے اسلاف سے بلند اور ہماری نوجوان نسل کا ہم سے بلند اور انکی آئندہ نسلیں ان شاء اللہ ایک خوش حال پاکستان دیکھیں گی۔

اصل میں پاکستان کی وہ کلاس جو ملک کے زیادہ تر وسائل پر قابض ہے وہ روشن پاکستان کی تصویر ہی دکھانا نہیں چاہتی لوگوں کو...... زندگی کے تاریک پہلو دکھائے جائیں چھوٹے مسائل بڑے بنا کر دکھائے جائیں ہر حادثے ہر سانحے کو سارا دن بریکنگ نیوز کے طور پر دکھایا جائے کہ صحت مند ذہن کہیں اپنی قوت نہ پہچان لیں اور اس مٹھی بھر حکمران مافیا کے خلاف متحد نہ ہو جائیں نظام کو بدلنے کی جستجو میں نہ لگ جائیں۔ اس لئے انکو مسائل کی دنیا میں رکھا جائے انکو پاکستان کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ ہی نہ ہونے دیا جائے۔

آپ بیرون ملک پاکستانیوں سے گفتگو کریں۔ ایک مقیم پاکستانی ہمیشہ نظام کی خرابی پر بات کرنا پسند کرے گا لیکن بیرون ملک مقیم ہمارے یہ رشتہ دار آپ محسوس کریں کہ اکثر پاکستان سے محبت کی باتیں کرتے ہیں، پاکستان کے بارے میں بہت جذباتی ہوتے ہیں، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ پاکستان مغربی ممالک کی طرح ترقی کرے۔ وہ وہاں کی منضبط زندگی کی خوبیاں اپنے ملک میں دیکھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں، وہ دیارِ غیر میں بیٹھ کر بھی پاکستان کی ترقی کے لئے کچھ کرنے کی امنگ رکھتے ہیں۔ کوئی زمینی یا آسمانی آفت آئے وہ زیادہ تڑپ جاتے ہیں اور اپنے سارے وسائل ملک کو اس آفت سے نکالنے کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے...... وطن سے دوری انکو وطن کی مٹی کے عشق میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ پاکستان کی خوبیوں کو 'زوم' کر کے دیکھتے ہیں جبکہ ہم خرابیوں کو۔

ایسا نہیں کہ یہاں سب کچھ اچھا ہے۔ مگر بہت کچھ بہت اچھا ہے۔ اس ملک میں ایسے کئی لوگ ہیں جو بڑے بڑے اداروں سے زیادہ رفاہی کام کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں چیریٹی کے جتنے ادارے ہیں، جتنا زکوٰۃ، صدقہ غریبوں کو دیا جاتا ہے، روزانہ لاکھوں غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے، بڑے بڑے چیریٹی کے ادارے بلاتخصیص مذہب ہر ایک کی مدد کرتے ہیں۔ ہزاروں تعلیمی اداروں میں لاکھوں بچے مفت تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہزاروں غریبوں کا روز مفت علاج کیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے ہسپتال اور ادارے مخیرّ افراد کے تعمیر کردہ ہیں جہاں خطرناک بیماریوں کے بھی بلا معاوضہ علاج کیے جاتے ہیں۔

ہم دنیا کی بہترین قوم جسے خدا نے دنیا کی بہترین سرزمین عطا کی اور ہم نے پورے شعور کے ساتھ اسکا نام ''پاکستان'' رکھا۔ کچھ ناعاقبت اندیشوں نے اس کی پاکی کا بھرم نہ رکھا مگر ہر آزمائش نے ثابت کیا کہ یہ ایک زندہ قوم ہے۔ اسلامی ریاستوں کے ماتھے کا جھومر پہلی ایٹمی اسلامی طاقت۔ بہترین پہاڑوں، معدنیات، سمندر اور دریاؤں کی سرزمین جس پر چار موسم اترتے ہیں۔ جس کو رب العزت نے بے پناہ، معدنی، انسانی وسائل سے نوازا ہے۔ پاکستانی جہاں جاتے ہیں اپنی قابلیتوں اور جفاکشی کا لوہا منواتے ہیں۔

ہماری قابل رشک چیز ہمارا بہترین خاندانی نظام...... جہاں اولڈ ہومز کی ہم ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ بزرگوں کی خدمت سعادت سمجھی جاتی ہے۔ جہاں شوہر اور بیوی شک کے ساتھ زندگی نہیں گزارتے جہاں بچے والدین پر اندھا اعتماد کرتے ہیں اور زندگی کے اہم ترین فیصلے بھی والدین کی مرضی سے کرتے ہیں۔ جہاں گھر کا کوئی ایک فرد ہسپتال میں ہوتا ہے تو پورا خاندان تیمار داری کے لئے موجود ہوتا ہے...... مہماندار اور تواضع پسند لوگ ہم اپنی بہت سی قیمتی اقدار پر آج بھی فخر کر سکتے ہیں اور یہ فخر اپنی نسلوں کا سرمایہ بنا سکتے ہیں۔

خرابیاں اور خراب لوگ ہر معاشرے میں ہوتے ہیں مگر ہماری

خرابیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور معاشرے کے صرف خراب تصور اور ''سیونگ فیس'' کو دنیا کے سامنے پیش کرنا خود ہمارے خلاف بڑی سازش ہے۔

آیئے اپنی زندگی کا نصاب بدلتے ہیں۔ انفرادی سطح یا اجتماعی، فرد ہو یا قوم خوبیوں کو تلاش کرتے ہیں۔ اور ان خوبیوں کو اپنی قوت بناتے ہوئے مزید خوبیوں کی پنیریاں لگاتے ہیں۔ ان درختوں کے پھل ہم نہ بھی کھائیں گے تو ہماری آئندہ نسلیں ضرور کھائیں گی ان شاء اللہ تتلیوں کی طرح پھولوں پر بیٹھنا سیکھیں تو سماج شہد کی خوشبو اور تاثیر سے معطر ہو جائیگا۔ ہمارے دشمن نے ہمیں مکھیوں کی طرح زخموں پر بیٹھنا سکھا دیا ...... اور ہم اپنے پروں سے جراثیم فضا میں پھیلاتے رہے ہماری زبانیں جب کھلتی ہیں ہمارے قلم جب لکھتے ہیں وہ پاکستان کی تباہی کا نوحہ لکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا ہاضمہ اور جگر کی گرمی دور کرنے کا یہی واحد نسخہ قرار پایا ہے۔

جس ملک نے ہماری قسمت سنوار دی ...... جو ہماری شناخت ہے، اسکا شکریہ ہم پر فرض ہے۔ آیئے اس کے شکریے کے طور پر اپنے زندگی کے نصاب میں اس کی خوبیوں کے شمار کا کالم بڑھاتے ہیں۔ شکر زبانی اور عملی کے طریقے سوچتے ہیں۔ اور تعفن پھیلانے والی زبانوں اور لکھاریوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ بڑے قرض ہیں اس مٹی کے ہم پر............!!

☆......☆......☆

عافیہ رحمت

میرے بچپن کے دن

ذہانت وہ عمدہ وصف ہوتا ہے جو ہر حال میں فرد کو ممتاز رکھتا ہے۔ حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، فرد کی ذہانت اُس کو سنبھالنے اور نکھارنے میں مدد و معاون ہوتی ہے۔

میں بچپن میں کیسی تھی؟ اس پر سے پردہ اٹھانا مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ کچھ مبہم سے چہرے، آوازیں اور القابات ہیں جو ذہن میں نمودار ہو رہے ہیں مگر یہ وہ چیزیں ہیں جن سے ہم پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔

بہت ہی چھوٹی عمر سے شروع کروں تو مجھے سب 'رونی بلی' 'روتی شکل' سے پکارتے تھے۔ ہر وقت رونا، بلاوجہ رونا اور رونے کے بعد چپ ہونے کا نام نہ لینا...... یہ میرے نمایاں کارنامے تھے۔ اب اپنے بچوں کو روتے دیکھتی ہوں تو اپنی امی کی تکلیف کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر ہم نے اپنی امی کو کبھی ہنستے مسکراتے دیکھا ہی نہیں۔ اب میرے بچوں کی حالت تو یہ ہے کہ روتے روتے ہنس دیتے ہیں۔ ویسے رونا کچھ اتنا برا بھی نہیں۔ نبی کریمؐ نے ایک جگہ فرمایا تھا کہ بچوں کی تین عادتیں ہمیں بہت کچھ سکھا دیتی ہیں (مفہوم کچھ ایسا ہے) ایک رو کر اپنی ضد منوا لیتے ہیں (سو تم بھی اپنے رب سے رو کر مانگو) دوسری آپس میں مل کر کھیلتے ہیں اور لڑنے کے بعد دلوں میں کینہ نہیں رکھتے۔ تیسری، مٹی سے کھیلتے ہیں (یعنی کہ تکبر نہیں کرتے)

اسکول جانا مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا (وہ اتنا زیادہ رونا برداشت نہیں کر پاتے) روتوں کو ہنسانے کا فن اسکولوں میں تھوڑی سکھایا جاتا ہے۔ وہاں تو صرف اے بی سی پڑھایا جاتا ہے۔ ٹیچروں سے پیار ملنے کی توقع ہی بے سود ہے۔ ایسے ہی وہ ہمیں روتا منہ بسورتا دیکھ کر سوچتی ہوں گی کہ اس کو چپ کرانا ہی بے سود ہے۔

وہ تو بھلا ہو ہماری بے حد محبت کرنے والی بڑی پھپھو (امت الرشید صاحبہ) کا، انہوں نے ایک اسکول کھولا اور ہمیں بھی وہاں داخل کرایا، تو ہم بڑی شان سے اسکول جاتے۔ وہاں پر ہمیں تھوڑی اہمیت اور توجہ ملتی تو ہمارے اندر کے چھپے ہوئے جوہر نکھرنے لگے۔

اہمیت، توجہ، قدر دانی اور پیار...... یہ ہی وہ قیمتی رویے ہیں جن کو چھوٹے بچے جذب کر لیتے ہیں۔ ان کی ننھی منی خواہشات کو اہم جاننا، ان کو پورا نہ کرنا ہو تو بھی غور سے سننا، توجہ دے دینا ان کو اندر تک مطمئن اور آسودہ کر دیتا ہے۔ یہ اب ہمیں سمجھ آتا ہے۔

میں بہت سست اور کاہل واقع ہوئی ہوں اسی وجہ سے شاید میری نشو و نما بھی سستی سے ہوئی اور پانچویں کلاس میں آنے کے بعد میں کلاس میں نمایاں پوزیشن لینے لگی۔ پھر غیر نصابی سرگرمیوں نے تھوڑا اور نکھارا۔ ہر انسان کو اللہ پاک نے منفرد بنایا ہے اور ہم ایک ہی ڈنڈے سے، ایک ہی ڈگر پر چلانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں (اسی لیے تو رونا آتا تھا)۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں جو دل لگا تو پڑھائی بھی اچھی لگنے لگی اور پھر اسکول بھی اچھا لگنے لگا اور پھر دوست بھی خوب ہی بن گئیں۔ اصل آنسو تو پیاری پیاری دوستوں کے بن جانے پر رُکے تھے!

آزادی اور مالی آسودگی (تھوڑی بہت) جہاں بچوں کو میسر آئے وہاں وہ خوش اور خود اعتماد بن جاتے ہیں۔ روک ٹوک، ڈانٹنا اور جھڑکنا بچے کی شخصیت کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

ہمیں اپنی چھوٹی پھپھو کے گھر میں یہ دونوں چیزیں وافر مقدار میں میسر آ جاتی تھیں۔ ان کے ویسے تو تین بیٹے تھے، وہ بھی ہم سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں رضوان بھائی کمپیوٹر پہ بھائیوں کے ساتھ لگے ہوتے۔ سب سے زیادہ مزہ ہمیں امان بھائی کے کمرے میں آتا۔ وہ ڈاکٹر بن رہے تھے۔ ہمارے آنے سے پہلے وہ اپنی تمام

چیزیں چھپا دیتے مگر ان کے کمرے میں لٹکا ہوا ریڈیم کا انسانی ڈھانچہ ہماری تمام تر توجہ کا مرکز ہوتا۔ کبھی کبھار وہ ہمیں اپنی دراز سے نکال کر سوکھی ہوئی انسانی ہڈیاں بھی دکھایا کرتے۔ اُس وقت ہم یہ پوچھا کرتے تھے کہ آپ کو ڈر نہیں لگتا اس کمرے میں سوتے ہوئے؟ اگر یہ ڈھانچہ رات کو چلنے لگا تو......اور وہ خوب ہنستے۔

رضوان بھائی کے کمپیوٹر پر جب ہم سب اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تو وہ ہمارا ہاتھ لگواتے اور کہتے دیکھو یہ کتنا گرم ہو رہا ہے، اب اس کو غصہ آ رہا ہے اور ہم سب ڈر کے کمرے سے باہر نکل آتے۔

انعام بھائی ہمیں خوب گُد گدیاں کرتے، لطیفے سناتے، پہیلیاں بجھواتے اور ہم سب ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

بارش میں ہمیں بہت مزہ آتا تھا۔ ہماری ایک پرانی سی سائیکل تھی، ہم بارش میں اس کو سڑکوں پر گھسیٹتے اور بہت خوش ہوتے۔ ہماری بے حد خواہش ہوتی کہ گلی میں کھڑے ہوئے گندے پانی کے اندر کشتی چلائیں اور جب ہم چلاتے اور ہوا کے دوش پر ذرا سی کشتی تیرنے لگتی تو ہماری خوشی دیدنی ہوتی ہمیں محسوس ہوتا اب ہمیں آسٹریلیا اور افریقہ کی سیر کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا......

اگلے ہی لمحے ہمارا کان امی کے ہاتھوں میں مچل رہا ہوتا!

جب ہم گیلے کپڑوں کے ساتھ پورے گھر میں گھومتے تو امی کا پارہ ہائی ہو جاتا۔ کوئی چپل سے پٹتا اور کوئی...... بڑی بہن ہمیشہ بچ جاتیں وہ فوراً کپڑے بدل کر نماز پڑھنی شروع ہو جاتیں اور با آواز بلند یہ نیت کرتیں۔

''یا اللہ! سو رکعت نفل میرا منہ کعبہ شریف کی طرف'' آج بھی سوچتے ہیں تو ہنسی آتی ہے۔ واقعی مصیبت میں صرف اللہ پاک ہی بیڑا پار لگاتے ہیں۔

بچپن کی حسین یادوں میں نانی کے گھر کا منظر سب سے انوکھا اور دلچسپ ہے۔ نانی کا گھر بہت ہی بڑا تھا۔ آدھا کچا تھا۔ درمیان میں بڑا سا جامن کا پیڑ تھا۔ پیچھے کی طرف املی اور شریفے کے درخت تھے اور ڈھیروں مرغے، مرغیاں پلی ہوئی تھیں۔ دن بھر وہ گلی میں آوارہ خرامی کیا کرتیں۔ ہمیں آج تک یہ سمجھ نہیں آتا کہ وہ گھر کا راستہ کیسے یاد رکھتیں۔ شام کو نانا بڑا سا دروازہ کھولتے، کبھی نرم بھیگی ہوئی روٹی ان کو دیتے، کبھی آٹے کی بھوسی کا سخت سا پیڑا بنا کر دیتے جاتے۔ نانا کہتے، نرم اور گیلا آٹا مرغیوں کو بیمار کر دیتا ہے اور ان کے منہ میں چپک جاتا ہے۔ مگر ہمیں یہ زیادتی لگتی اور ہم فرج سے آٹے کا پیڑا ضرور لے کر آتے اور مرغی کو دے دیتے۔ وہ بیچاری تھوکتی اور اپنی چونچ بہت دیر رگڑتی رہتی۔ ہمارا ہنس ہنس کر برا حال ہو جاتا۔

پیچھے کی طرف ایک مٹی کا بڑا سا چولہا بھی تھا جو ہمارے آنے پر جلتا اور خاص کر جب اس کے نیچے نانی لکڑیاں جلا کر ڈالتیں اور ہمیں کہتیں بیٹا سوکھے جامن کے پتے بھی چن لاؤ تا کہ آنچ تیز رہے۔ جب کھانا پک جاتا تو آخر میں گرم گرم راکھ میں شکر قندیاں دبا دیتیں۔ دو، تین گھنٹے بعد وہ پتہ نہیں کیسے پک جاتی تھیں۔ اب ہم سب سمجھ جاتے ہیں مگر اُس وقت حیرت ہوتی تھی اور خوشی بھی۔ وہ ذائقہ اور مٹھاس اب ہمیں اس طرح ابال کر کھانے میں محسوس نہیں ہوتا۔ نانی جان کہتیں جو سبزیاں زمین کے نیچے اُگتی ہیں ان کے اندر نمی جذب ہو چکی ہوتی ہے اس لئے زیادہ پانی نہ ڈالو تو ذائقہ برقرار رہتا ہے۔

اپنی گڑیا کے کپڑے سینا اور موتیوں سے اُس کے لیے زیورات بنانا، پھر گڑیا کے کان چھیدنا بھی یادگار رہے۔ ایک دفعہ ہم بڑی شان سے قالین پر بیٹھ کر اپنی گڑیا کے کپڑے کاٹ رہے تھے مگر قینچی بے حد مشکل سے چل رہی تھی۔ پریشان ہو کر جب کپڑا اٹھایا تو نیچے قالین بھی کٹ چکا تھا۔ اس پر ہمیں جو ڈانٹ پڑی وہ بھولتی نہیں۔

ملتانی مٹی کو گیلا کر کے ڈھیروں وضع کے کھلونے بنانا بہت ہی مزیدار کھیل تھا۔ ہم اپنی امی کی دیکھا دیکھی ہمیشہ کوفتے اور کباب بنایا کرتے تھے۔ اب یہ سوچ کر خوب ہنسی آتی ہے۔

اسکول کے باہر مچھلی والا کھڑا ہوتا تھا جس سے ہم پانچ روپے کی پندرہ کالی، پیلی اور سرمئی مچھلیاں خریدتے۔ مشکل سے وہ پندرہ دن زندہ رہتیں۔ گلی کے نکڑ پر بنی چھوٹی دکان سے دو روپے کا چھوٹا اور پانچ روپے کا بڑا بن مل جاتا تھا۔ وہ اتنا بڑا ہوتا تھا جتنی بڑی آجکل دکان میں

تندروی روٹی ملتی ہے۔یہ ہمارے لئے خوب عیاشی ہوتی تھی۔

ہمارے اکلوتے ماموں نے جب موٹر سائیکل لی تو ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ جب ماموں ہمارے گھر آتے تو واپسی میں وہ ہمیں اُس بائک پر بٹھا کر چکر لگواتے۔ہم گلی کے بچوں میں خود کو بادشاہ سمجھنے لگتے۔

چھت پر بھائیوں کے ساتھ پتنگ اڑانا، گھر کی منڈیر پر چڑھ کر تھیلی کو ہوا میں اڑانا، بلبلے پھلانا، لنگر لڑانا یہ سب یادیں آج تک جگمگاتی ہیں۔

اکثر صحن میں بیٹھ کر ہم چار بڑے بہن بھائی اسو، پنچو، ہار، کبوتر، ڈولی کھیلا کرتے تھے۔جب ہم نکل جاتے اور دوبارہ ہمارا نام آتا تو سب ہماری طرف لپکتے، اور اسی لمحے ہمارے دماغ سے وہ لفظ غائب ہو جاتا۔ بیچارگی سے ہم رو پڑتے تو یاد آتا، رحمت اللہ، رحمت اللہ...... جب ہاتھ جوڑ کر رکھتے اور کرارے کرارے چماٹے پڑتے تو خوب مزہ آتا۔

رم جھم یادوں کی برکھا رُت میں آپ کو شریک کیا ہے۔کہیے اپنے بچپن کی جھلک نظر آئی ہے؟

☆......☆......☆

شمیرا شاہد

کنیز حاضر ہے!

رکن جماعت اسلامی اور ناظمہ گوجرانوالہ ڈویژن کنیز فاطمہ مرحومہ کا مشکبو تذکرہ، ان کی صاحبزادی کے قلم سے

نانا جان نے امی کا نام کنیز فاطمہ کیا سوچ کر رکھا ہوگا؟ یقیناً فاطمہؓ بنت محمدؐ کی کنیز ہی مراد ہوگا۔

اور اسی لئے تو......اُن کی زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو قرآن کی تفسیر نظر آتی ہے۔ میں امی کی گود میں تھی جب انہوں نے ترجمہ وتفسیر سے قرآن پڑھا غالباً 1964-1965 کا دور ہوگا۔ 2015 تک 50 سال قرآن کی تعلیم وتربیت میں گزرے، صبح فجر کی نماز کے بعد نوجوان بچیوں کا ایک گروپ پڑھتا تھا پھر ابا جان کو رخصت کر کے 10،11 بجے دوسری کلاس ہوتی تھی، اور کبھی شام کو عصر اور مغرب کے درمیان ایک تیسرا دور بھی ہوتا تھا۔ انتہائی مجبوری کے بغیر اس معمول میں فرق نہیں آتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جماعت اسلامی کی رکن اور ناظمہ ہونے کی حیثیت سے بے شمار تحریکی ذمہ داریاں نبھا رہی تھیں۔ آٹھ بچوں کی ماں اس تڑپ سے بے قرار تھی کہ:

''اے ہمارے رب ہمارے ساتھیوں اور اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنادے اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔'' (74 القرآن)

تمام بچوں کی نماز کے لئے انتہائی متفکر ہوتی تھیں۔ جس کی نماز میں سستی دیکھتیں اس پر سخت خفا ہوتیں۔ ابا جان ٹی وی دیکھنے کے شوقین تھے، ان سے اس بات پر خفا ہوتیں کہ رات کو دیر تک جاگنے سے صبح کی نماز میں تاخیر ہوجائے گی۔ سب بیٹیوں کی شادی سے پہلے دنیاوی تعلیم، سلائی کڑھائی کے ساتھ قرآن خود ترجمے سے پڑھایا چھوٹے بچوں کو رات کو ساتھ لٹاتیں تو نبیوں کے قصے سناتیں۔ بچپن میں مجھے حضرت عمرؓ پر ایک نظم سکھائی جس کا پہلا شعر تھا:

نبیؐ کے صحابی تھے حضرت عمرؓ
نہایت دلیر اور نہایت نڈر

اکثر اس نظم کے اشعار میرے ساتھ مل کر دہراتیں اور پھر آبدیدہ ہوجاتیں۔

علامہ اقبال کی شاعری کی بہت گرویدہ تھیں۔ اکثر ان کے اشعار بہت سوز سے گنگنایا کرتی تھیں۔ قرآن میں آتا ہے: یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تم ہی میں سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو (الروم۔21) میرے ماں باپ دونوں اس کی عملی تصویر تھے، دادا جان، دادی جان کی خدمت میں امی کبھی کوتاہی نہ کرتیں۔ خود اپنے ہاتھ سے ان کے لئے کھانا بناتیں۔ ہم بچوں کو سارا وقت ان کا خیال رکھنے کی تاکید کرتیں حتیٰ کہ بعض اوقات بیماری میں اپنا کمرہ چھوڑ کر دادی جان کے ساتھ والے بستر پر سو جاتیں۔ صبح شام ان کے سرہانے دودھ رکھتیں۔ لاہور تربیتی نشستوں میں جاتیں تو فجر کے وقت خاص طور پر یاددہانی کے لئے فون کرتیں کہ دادی جان کے کمرے میں دودھ رکھ دیا گیا؟

ابا جان کی وفات کے بعد بھی ان کی بہنوں کے حقوق کی فکر ہوتی اور ہمیں بھی ان کی عزت ومحبت کا درس دیتیں۔

یہی جذبہ وہ ہم پانچوں بیٹیوں میں دیکھنا چاہتی تھیں۔ نواسیوں کے اصرار پر ایک دن انہوں نے بتایا کہ تمہارے نانا سے شادی کے پہلے دن جو باتیں میں نے کہیں وہ یہ تھیں ''مجھے رزقِ حلال کھلانا اور اگر میں آپ کے مال سے کچھ خیرات کردوں تو ناراض نہ ہونا'' یہ تھا انکی نئی زندگی کا آغاز! ہمیشہ شوہروں کی شکرگزاری کا درس یہ کہہ کر دیتیں کہ:

''نیک عورتیں اطاعت شعار ہوتی ہیں۔'' (القرآن)

کسی بے جا ضرورت پر مال اڑانا انہیں سخت ناگوار تھا۔ جوانی میں بھی ان کا اپنا حال یہ تھا کہ کسی شادی بیاہ پر جانا ہوتا تو کوئی پرانی قمیض

نکال کراسے ٹھیک کرنے لگتیں۔ ہماری شادیوں پر ابا جان جہیز کے لئے رقم دیتے تو اسکا بہت سا حصہ اللہ کی راہ میں دے دیتیں۔ جہیز کی رسم پر بہت ناگواری سے خرچ کرتیں ہر بات میں ہمیں صبر اور شکر کی نصیحت ہوتی حتیٰ کہ میرے چھوٹے بہنوئی کا انتقال ہوا تو فوزیہ بہن سے کہنے لگیں ''میں اور تمہارے مرحوم ابا جان تم سے صرف اس صورت میں خوش ہونگے اگر تم صبر کرو۔'' مبادا کہ اس معصوم کا پیمانہ صبر لبریز ہو جائے۔

کسی بیٹی کے سسرال کی کسی بھی زیادتی پر کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا بڑی سے بڑی بات پر بھی ایسے اظہار کرتیں گویا کچھ خبر ہی نہیں۔ کل میرے شوہر مجھ سے کہہ رہے تھے ''تمہاری نہیں، مجھے لگتا ہے میری امی فوت ہوئی ہیں، اب میں تمہاری شکایت کسے لگاؤں گا؟''

ہمیں ہر حال میں جھک جانے کا درس تھا۔ شوہروں کے حقوق میں ذرا سی لا پروائی انہیں پسند نہ تھی اور وہ خود ہمارے لئے اس کا عملی نمونہ تھیں۔ ابا جان کی اطاعت و محبت میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ ان کی طویل بیماری میں ہر مصروفیت ترک کر کے ان کی خدمت میں دن رات ایک کر رکھا تھا۔ ہر حکم پر آمنا و صدقنا کا رویہ تھا۔ دونوں میں بہت محبت تھی۔ گویا ایک جان دو قالب تھے ہر نیک جذبے میں ایک دوسرے کے دست راست۔ امی کی تمام جماعتی ذمہ داریوں میں ابا جان کا بھرپور تعاون ہوتا امی کے پاس لوگ طرح طرح کے مسائل لے کر آتے اور امی ان کے مسائل ابا جان کے سامنے پیش کرتیں جنہیں حل کرنے کے لئے وہ ہسپتالوں، سکولوں اور کچہریوں تک بھاگتے رہتے۔

ملکی و قومی مسائل ان دونوں کے لئے اہم تھے۔ ہم نے انہیں اپنے بچوں کے روز مرہ مسائل سے زیادہ فلسطین، کشمیر اور لبنان کی صورت حال پر پریشان دیکھا۔ 1971ء کی جنگ ہوئی تو امی کی شادی کو صرف 10 سال ہوئے تھے۔ 5 بیٹیاں تھیں، سارا زیور دفاعی فنڈ میں دے دیا ابا جان اپنی صحت کی کمزوری کے باوجود دن رات رضا کارانہ فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کی شخصیت خدمت خلق کا مجسمہ تھی انہوں نے اپنی ذات فلاحی کاموں کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ انہیں دیکھ کر یہ آیت مبارکہ ذہن میں آتی تھی کہ:

''وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگر چہ محتاج ہی کیوں نہ ہوں''

1977ء میں پی این اے تحریک چلی تو دونوں دن رات سرگرم تھے۔ مقصد کسی شخصیت کی مخالفت نہ تھا، ملک کے نظریے کی حفاظت تھا۔ لاہور مال روڈ کے دھرنے میں امی کو آنسو گیس کا شیل لگ گیا تھا۔ ٹانگ بری طرح جھلس گئی تھی ابا جان جھنگ جیل چلے گئے تھے۔ مجھے ایک ماہ تک ٹائیفائیڈ بخار رہا۔ بڑی بہن کا نکاح ملتوی ہو گیا مگر کوئی چیز امی کے جذبے کی راہ میں حائل نہ تھی۔

ابا جان کے بعد امی کے بیٹے ظہیر اور مبین ان کے مشن میں ان کے دست راست تھے۔ بے شمار خواتین کے وظیفے اور بیسیوں مسائل زدہ لوگ ہر وقت ان کے ارد گرد رہتے تھے۔ اگر کبھی میرے پاس لاہور ہوتیں اور نیا مہینہ شروع ہو جاتا تو ہر حال میں واپس جانا چاہتیں کہیں ایسا نہ ہو پریشان زدہ عورتیں دور دور سے آ کر واپس لوٹ جائیں۔ دردمندی کا یہ جذبہ اب ظہیر کی فرمانبرداری کی شکل میں پھل پھول رہا تھا۔ امی کے کسی حکم پر اس نے انکار نہیں کیا۔ ابرو کے اشارے سے پہلے وہ سب کچھ کر دکھاتا جو امی چاہ رہی ہوتی تھیں، امی کی فکریں اب اس کی فکریں تھیں اور امی کے غم اس کے غم تھے۔ بہن بھائیوں کی ہر مشکل میں وہ جان و مال کے ساتھ پیش پیش رہتا۔ اس جذبے میں موروثیت کے ساتھ تربیت کا اثر شامل تھا۔ محبت، رواداری، معافی، خلوص، صبر، دردمندی، ان سب جذبوں کی عملی شکل ظہیر نے اپنے والدین میں دیکھی تھی۔ ایک دفعہ ظہیر کے بچپن میں سڑک پر بیمار گدھے کو دیکھ کر امی غمزدہ ہو گئیں تو ظہیر جا کر اسے پانی پلاتا رہا۔ وہی بیج آج پھل لا رہے تھے۔ مبین امی کی تیمار داری میں دن رات ایک کیے رکھتا، بھابھیاں، خاص طور پر ثمینہ بھابی ہر طرح سے اپنی خدمات کے ساتھ حاضر رہتی یوں سمجھیں کہ جوانی کی ساری محنتیں بڑھاپے کا ثمر تھیں۔ گویا پھل دار درخت اب اپنے جوبن پر تھا۔

ابا جان کی محبت، اولاد کی فرمانبرداری، مال و دولت کی ریل پیل اللہ نے کسی چیز میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بہویں، بیٹے، بیٹیاں، پوتے، پوتیاں سب جاں نثار تھے۔ قدرت نے تصویر میں رنگ بھر دیئے تھے۔

پچھلے کئی سالوں سے بیماری سے لڑ رہی تھیں۔ لاہور میں ان کے معالج تھے اس لئے مجھے بھی کبھی کبھار ان کی تیمارداری کا شرف حاصل ہو جاتا تھا۔ تکلیف کی شدت میں بھی اپنی نماز میں کوتاہی نہیں کرتی تھیں میں نے کئی بار راتوں کو ان کی زبان پر یہ الفاظ رواں دیکھے۔

اِنّ الذین قالو ربّنا اللہ ثم استقامو تتنزّل علیھم الملٰئکۃ (حٰم السجدۃ)

''جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔''

میرے سسرال کا ماحول کچھ مختلف تھا، اکثر یہ کہہ کر مجھے اور اپنے آپ کو مطمئن کرتیں کہ شاید اللہ نے تمہارے ذریعے اس گھر میں دین پہنچانا ہو۔ آج جب میں اپنے بیٹے کو تلاوت قرآن کرتے ہوئے دیکھتی ہوں تو لگتا ہے کہ یہ سراسر میری ماں کی دعا ہے۔ اب اس آخری عمر میں نادار بچوں کے لئے ایک سکول بنایا تھا جس کے استادوں کی تنخواہوں، بچوں کے نصاب، تربیت ہر چیز میں حصہ لیتی تھیں، اس کے لئے فنڈ مہیا کرتیں تاکہ بڑھاپے کے یہ دن بھی صرف اپنی ذاتی زندگی تک محدود نہ ہو جائیں۔

2 اکتوبر کو ہسپتال میں داخل ہوئیں طبیعت انتہائی ناساز تھی۔ بولنا بھی دشوار ہو گیا تھا بڑی بہن فرح ہمیشہ کی طرح اپنی خدمات لئے اسلام آباد سے پہنچ گئی تھی۔ سب بہن بھائی جمع ہو گئے تھے۔ میں جس وقت سی سی یو میں ان کے ساتھ اکیلی تھی، میں نے کہا چلیں امی دعا مانگتے ہیں۔ **اذھب الباسٌ ربّ الناس** سے لیکر دنیا و آخرت کی بھلائیوں تک بہت سی دعائیں مانگیں اور وہ دھیرے دھیرے آمین کہتی رہیں۔ اگلے دن قومہ میں جانے سے پہلے میں نے ان کے پاس بیٹھ کر سورۃ یٰسین، الرحمٰن پڑھی انہیں یہ سورتیں زبانی یاد تھیں۔ میرے ساتھ لب ہلاتی رہیں اور پھر آنکھیں بند کر لیں یوں آخری سانسیں بھی قرآن کی رفاقت میں گزریں، گویا قرآن جینا ہو گیا قرآن مرنا ہو گیا۔

''بے شک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا اللہ رب العالمین کیلئے ہے۔''

5 اکتوبر شام 4 بجے وہ ہم سے جدا ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں سوموار کا دن تھا اور عین عصر کا وقت، جب فرشتے بندوں کے اعمال اللہ کے حضور پیش کرتے ہیں۔ مجھے ایسا لگا، امی اپنے رب کے دربار میں کھڑی کہہ رہی ہونگی۔

''بادشاہ سلامت کنیز حاضر ہے''

اور فرشتے استدعا کر رہے ہونگے:

''کچھ چہرے تروتازہ ہونگے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہونگے۔'' (22،23 القیامہ)

جنازے پر لوگوں کا ایک جم غفیر تھا بے شمار قرآن کے ساتھی تھے جو سراسر ان کی آخرت کا سرمایہ تھے۔ ان کو امراء سے دوستیوں کا شوق نہ تھا بلکہ غریبوں کے دکھ درد کی ساتھی تھیں۔ آج بھی ان کی کثیر تعداد موجود تھی جیسے نبی پاکؐ کی دعا دہرا رہی ہوں۔

''اے اللہ مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرما''

چھوٹے بڑے، اپنے پرائے، میکے سسرال سب ان کی نیک نامی کی گواہی دے رہے تھے۔ کسی بہن نے مجھ سے کہا، آج یہ آیت سمجھ آئی ہے۔

''اے رب مجھے حکمت عطا کر میرے بعد بھی مجھے نیکی سے یاد رکھا جائے اور مجھے جنت نعیم کے وارثوں میں شامل فرما (83،85 الشعراء)

اللہ ہمیں ان کے لئے صدقہ جاریہ بنا دے ان کے حقوق میں ہم سے جو کوتاہیاں ہوئیں ہمیں معاف فرما دے، ان کی لغزشوں سے درگزر فرما اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرما۔

ربِّ ارحمھما کما ربّیٰنی صغیرا (آمین)

☆......☆......☆

محشر خیال

ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی ۔ لاہور

میری پھول ہوا اور خوشبو جیسی دوست صائمہ! رب رحمٰن سے آپ کے ایمان وصحت کی سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ! آغا جان کو جدا ہوئے اس 6 جنوری کو 3 برس پورے ہو جائیں گے تو تمہیں ویسے ہی ایک خط لکھنے کا ارادہ کیا تھا کہ آغا جان کی خواہش تھی کہ جہاد افغانستان کی یادداشتیں تم اور میں مل کر مرتب کرلیں انہوں نے مجھ سے دو دفعہ یہ بات کی تھی اور ایک موٹی سی فائل میرے حوالے بھی کی تھی کہ اسے دیکھ لینا۔ پھر وہ انہوں نے جہاد کشمیر کے ایڈیٹر عبد الہادی صاحب کے حوالے کی۔ انہوں نے طبیعت کی خرابی کے باعث اسے مرتب نہیں کیا اور انکے حوالے سے کچھ یادداشتیں خود تو مرتب کیں مگر یہ بڑا کام ہنوز ویسے ہی پڑا ہوا ہے۔ میں نے بھی دو تین لوگوں کے ساتھ بات کی مگر ابھی تک بات نہیں بنی۔ اللہ کرے کہ میں اور آپ مل کر اسکا کچھ اچھا سا سبب بن سکیں اور جہاد، نصرت اور خدمت کی یہ انوکھی تاریخ مرتب کرنے میں اپنا حصہ ڈال سکیں۔

میں نے یہ خط لکھنا تھا کہ اس ماہ کے بتول میں پورے نو ماہ کے بعد UN کانفرنس کی روداد پڑھنے کو ملی۔ یادیں تازہ ہوگئیں۔ بتول ہر ماہ باقاعدگی سے ملتا ہے اور میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ایک ہی نشست میں سارا پڑھ لوں۔ بہت عمدہ مضامین ہوتے ہیں اور بہت بوجھل کاموں میں لطیف پیرایوں سے معطر بتول آرام وسکون کا باعث ہوتا ہے۔ ٹائٹل بھی بہت خوبصورت چھپ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے اسے صدقۂ جاریہ بنائے۔ دعاؤں کے ساتھ۔

☆☆☆

کرامت بخاری، لاہور

آپ کا پرچہ وقت کی اہم ضرورت ہے، آپ نے اپنی اقدار و روایات، اسلامی تشخص، تہذیب، ثقافت، خصوصاً خواتین کی کردار سازی کے حوالے سے جس تحریک کا آغاز کیا ہے وہ آج کے لمحہ موجود کی لیے بہت ہی اہم ہے۔ ہم مغرب کی طرح مادر پدر آزاد نہیں ہو سکتے، خدارا اس فیس بک انٹرنیٹ، اور موبائل کی منفی یلغار کو روکئے جرائم حد سے تجاوز کرتے جا رہے ہیں اور ہم برباد ہوتے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

رخسانہ اقبال راؤ ۔ لاہور

پچھلے کسی شمارے میں فرحت طاہر نے لکھا کہ لوگ تو تبصرے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کجا کہ کچھ تحریر فرمائیں۔ پڑھ کر بہت شرمندگی ہوئی اور تہیہ کرلیا کہ لاکھ مصروفیت سہی مگر اب قلم ضرور اٹھانا ہے۔ کیونکہ اتنے مزے مزے کی چیزیں جو ہر ماہ ہم حلوے کی طرح نگل جاتے ہیں آخر ان کا کچھ حق بھی تو ادا کرنا بنتا ہے۔

دور جدید کے درویش خرم مراد کا مضمون ’’تلاوت کے آداب‘‘ بے حد مفید انتخاب ہے پتہ نہیں تحریر میں حلاوت ہے یا جاذبیت کا کوئی لمحہ ہوتا ہے کہ الفاظ اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ قول نبیؐ میں بنتِ حوا کی تحریر پر اثر ہے۔ حبیب الرحمٰن صاحب نے نظم کے اندر بہت سے دلوں کے جذبات کو زبان دے دی۔ ماشاءاللہ کمال کہا کہ ’’ابھی ہم کچھ نہیں کہتے!

’’قانتہ رابعہ نے غیرت ہے بڑی چیز‘‘ میں بڑا حساس مسئلہ خوبصورت انداز میں چھیڑا ہے۔ افشاں نوید تو ہم سے پہلے بھی دور نہ تھیں، ’’اتنا قریب‘‘ لکھ کر اور قریب ہو گئیں۔ ’’میرے مہربان‘‘ میں

فرح وقار نے نفسیاتی مسائل کا لازوال حل پیش کیا ہے۔

''سود بے سود'' میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے، معاشرے میں ہر چوتھے گھر میں پیش آ رہی ہے۔ آمدنیوں میں سود کو تجارت کے ساتھ ملا کر حلال سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ گارنٹیوں والا دین! ''بہتر ایک تہتر'' میں سدرہ سحر عمران نے ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ آج کے صالح نوجوان واقعی پریشان ہیں کیونکہ آباؤ اجداد کے پیچھے چلنے والے روایت پرست انہیں جینے نہیں دیتے۔ سعدیٰ مقصود اگر ہر بار کچھ لکھتی رہیں تو ایسے قابل لوگوں کی یادداشتیں محفوظ ہو جائیں گی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ آج فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں جو طالبات مخلوط ماحول سے آزاد تعلیم پا رہی ہیں، اس کے پیچھے کتنی کوششوں کا دخل ہے۔ نصرت یوسف کے ''سفیر سخن'' میں حب الوطنی کے کئی رنگ نظر آتے ہیں۔ اور پھر آج افراتفری کے دور میں لوگ رشتہ داریوں اور دوستیوں کو کم ہی اتنا نبھا پاتے ہیں۔

آسیہ راشد بڑی عرق ریزی سے نادر معلومات کشید کر کے ہمیں فراہم کر رہی ہیں شکریہ باجی! ڈاکٹر شگفتہ نقوی تو اپنے نام کی طرح ہی شگفتہ لکھتی ہیں۔ ہر عنوان پر گویا ان کا قلم ماشاءاللہ پھسلتا ہی چلا جاتا ہے بے دریغ۔ میری لائبریری میں روشن آبگینے کا تعارف دیکھ کر دل چاہ رہا ہے کہ ہر بار ایک آبگینے سے بتول میں بھی ملوا دیں تو کیسا رہے گا؟

افشاں نوید کی قیدی خواتین پر تحریر ڈاکٹر فلزہ اور بشریٰ تسنیم کی تحریریں بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکیں۔

81 صفحات کے رسالے میں بیس قلم کاروں نے جو گل بوٹے کھلائے ان پر مختصر تحریر میں تبصرہ کرنا بھی شاید ناانصافی ہو مگر ماشاءاللہ ہر ماہ معیار پہلے سے بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ لکھنے والوں، مجلس ادارت اور منتظمین کے لیے بہت سی دعائیں۔

☆☆☆

فرحت طاہر۔ کراچی

ماہ نومبر کا بتول ۱۴ تاریخ کو مل گیا، مگر ہاتھ میں آنے سے قبل ہی محشر خیال میں شائع ہونے والے ہمارے خط اور اس کے جواب کی بازگشت ہمارے کانوں تک پہنچی اور ہم سہم کر رہ گئے۔ یہ خط بہت ہلکے پھلکے انداز میں شروع کیا تھا مگر کچھ تلخی سی بھر گئی جس نے ہماری مدیرہ کی آنکھوں کو بھی نم کر دیا!!

دراصل یہ خط جب لکھا گیا تو اشاعت کے لیے بھیجنے کی تقریباً آخری تاریخ تھی اور بنا دوسری نظر ڈالے حوالہ کر دیا گیا تھا۔ بعد میں اسکے مندرجات دیکھے تو دعا کی کہ شائع ہی نہ ہو یا پھر مدیرہ ایڈٹ کر دیں مگر ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ من وعن شائع ہوا اور ساتھ ہی مدیرہ کی وضاحت بھی! مزید جواب کی ضرورت تو نہ تھی مگر خط سے شاید تشہیر کی طمع جھلکتی نظر آئی تو بات مکمل کرنا ضروری لگا کہ ادھوری بات ہمیشہ ابہام کا باعث بنتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کراچی میں بتول ۱۵ تاریخ کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے مگر اس سے پہلے لاہور، اسلام آباد اور دیگر شہروں سے ساتھیوں کے sms آجاتے ہیں اور پھر جیسے جیسے ہاتھوں میں آتا ہے فیڈ بیک ملتا ہے اور وہاں وہاں سے ملتا ہے جہاں سے امید اور توقع بھی نہیں ہوتی....قارئین ذاتی طور پر تو اپنا تبصرہ پہنچا دیتے ہیں۔ خط کا مقصد محض اپنی تعریف سننا ہرگز نہیں بلکہ قارئین کے تبصروں کی شکایت دراصل تمام قلمکاروں کی نمائندگی کی تھی۔ دوسرے تبصرے، تنقید اور خطوط بذات خود اصناف ادب میں شامل ہیں جو یقیناً ذخیرہ ادب میں اضافہ کا باعث بن سکتے ہیں! تیسرے تحریری تبصروں کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی جو یقیناً رسالے میں دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں!

اب یہاں پر خود نمائی کا اعتراض ہو سکتا ہے کہ ہر مہینے رسالے میں اپنا نام دیکھ کر بھی تسکین نہیں ہوتی......! تو عرض یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ہنر و فن ہو اپنے دائرہ کار سے ہی داد یا توجہ کا منتظر رہتا ہے بلاگز کی دنیا میں بھی یہ ہی اصول چلتا ہے کہ بلاگ پر جا کر تبصرہ کریں! یہ قارئین کو بات سمجھنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ بہت سارے افراد تبصرے پڑھ کر ہی مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تحریر گمنام نہیں رہ سکتی کہ اس پیشے کا تقاضا یہ ہی ہے اور اہم بات یہ کہ یہ کوئی ایسا عہدہ بھی نہیں جو سابق ہو سکے۔ قلمکار قلمکار ہی رہے گا خواہ مر ہی کیوں نہ جائے! یہاں پر خرم

مراد مرحوم کا واقعہ یاد آتا ہے کہ جیل کے قیدی نے ان کی کتاب پڑھ کر ان کو خط لکھا جبکہ ان کے انتقال کو برسوں گزر چکے تھے!

اب رسالے کی بات ہو جائے! اس کو موثر اور دلچسپ بنانا کیوں ضروری ہے؟ پچھلے دنوں جسٹس حاذق الخیری کی سوانح عمری پڑھنے کا موقع ملا۔ اس میں وہ اپنے دادا راشد الخیری (مصور غم) کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں اصلاح معاشرہ خصوصا خواتین کی حالت بہتر بنانے کے لیے تین رسالے جاری کیے تھے جن میں عصمت، بنات (لڑکیوں کے لیے) اور جوہر نسواں (کشیدہ ردستکاری) شامل تھے جو بہت موثر تھے، مگر ان کی آنکھ بند ہوتے ہی بنات اور جوہر نسواں دم توڑ گئے (پچاس سال شائع ہونے کے بعد) اور عصمت جو ۲۰۰۸ء میں سو سال کا ہو گیا ہے، کینسر کے مریض کی طرح زندہ ہے! اتفاق سے دسمبر ۲۰۱۳ء کا عصمت رسالہ دیکھنے کو ملا سخت مایوسی ہوئی۔ بڑے بڑے نام، بڑے بجٹ، موثر نظریہ، طاقتور عہدے اور خاندان کچھ بھی اسے تابندگی نہیں دے پا رہا! وجہ؟ بدلتی ہوئی اقدار و روایات، ماحول و حالات سے ہم آہنگ نہ ہو سکا (ذاتی رائے!)

جب اس پس منظر میں ہم بتول اور اپنے دیگر اداروں کو دیکھتے ہیں تو احساس زیادہ ہوتا ہے کہ کتنا ہی شاندار ماضی اور نظریہ کیوں نہ ہو اگر وہ حال کی کرنسی میں تبدیل نہیں کیا جائے گا تو اپنی جاذبیت اور کشش وقت کے ساتھ کھو بیٹھے گا۔ اہم بات یہ کہ یہ تبدیلی کسی پیوند کی طرح لگی محسوس نہ ہو بلکہ ایک فطری تناسب، مقدار اور رفتار سے ہو! یقیناً بتول کے حوالے سے وہ قارئین اور قلمکار جنھوں نے ہجری اور عیسوی دونوں صدیوں کو اپنی آنکھوں سے تبدیل ہوتے دیکھا ہے اس بات کے زیادہ ذمہ دار ہیں کہ تاریخ کے اس سفر میں پُل کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنی تہذیب اور اقدار کو درست، متوازن اور سبک رفتاری سے گامزن کریں!

سوئے ہوئے قارئین کو زبردستی جگانے پر بہت معذرت!

☆ ڈیئر فرحت! جیتی رہو، لکھتی رہو اور جگاتی رہو (ص۔ا)

☆......☆......☆

خورشید بیگم۔ گوجرہ

انتہائی سادہ مگر پرکشش سرورق کے ساتھ بتول میرے ہاتھ میں ہے۔ الحمد للہ کہ تبصرہ لکھنے کی توفیق مل گئی۔ بہن صائمہ اسماء کا اداریہ دل کو چھو لینے والا ہے جرم وفا کے گنہ گاروں کو عموماً سزا ہی ملا کرتی ہے مگر اس جرم کی لاج تختہ دار تک رکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ وطن عزیز کے اُن سب شہداء کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین)۔

عظمیٰ پروین صاحبہ نے عبادت کا مفہوم بہت اچھے طریقے سے سمجھایا ہے۔ پروفیسر محمد اکرم صاحب نے سیرت النبیؐ کا منفرد موضوع منتخب کر کے ہمیں معلومات فراہم کی ہیں۔ بابر مشتاق صاحب کا مضمون واقعی خاص مضمون ہے۔ کاش یہ مسلم ممالک خصوصاً پاکستان کے حکمرانوں کی توجہ کا باعث بن سکے۔ ''حجاب'' نظم بے حد پسند آئی۔ ڈاکٹر عزیزہ انجم کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں!

محترمہ ربیعہ ندرت صاحبہ کی کہانی ''ہاتھ سے جنت نہ گئی'' بہترین مثال ہے ان کے لئے جو نسلی مسلمان ہیں لیکن اپنی اس جنت سے محروم رہتے ہیں۔ ڈاکٹر شگفتہ نقوی صاحبہ کی کہانی ''مجھے تیری ضرورت ہے'' واقعی ان نوجوانوں کے لئے عبرت آموز ہے جو سمجھتے ہیں کہ بیرون ملک جا کر ہی ترقی کے خواب پورے ہو سکتے ہیں۔ ''پس آئینہ'' نصرت یوسف صاحبہ کی بہترین کاوش ہے حقیقتاً ماں رحمت کا خزانہ ہے اور نیک بیوی بہترین نعمت۔

آسیہ راشد صاحبہ نے مدر ٹریسا کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ فرحت طاہر صاحبہ کی تحریر ''اجنبی نہیں ہم'' واقعی نہاں خانہ دل سے نکلی ہے۔ اگر ہماری اگلی نسل سانحہ مشرقی پاکستان سے روشناس نہیں ہوگی تو آج بنگلہ دیش میں پاکستان کے لئے قربانیاں دینے والوں کو قومی ہیرو کیونکر تسلیم کرے گی؟ گوشۂ تسنیم ہمیشہ کی طرح میرا پسندیدہ ہے۔ بہن قانتہ رابعہ کی ہلکی سی جھلک بتول میں نظر آئی، تشنگی رہی۔

☆......☆......☆

بتول میگزین

ترقی کا زینہ

عابدہ فرحین۔کراچی

اسلام آباد میں ورکنگ وومن سیمینار تھا جس میں اسلام آباد کی (خصوصاًاور باقی علاقوں کی عموماً) خواتین مدعوتھیں۔

روس کی دوخواتین جواردو سیکھنے کی غرض سے اسلام آباد آئی ہوئی تھیں انہیں بھی تقریب کی شان بڑھانے کیلئے بلالیا گیا۔

تقریب سے خطاب کے دوران خواتین نے روس کی ترقی کی مثال دیتے ہوئے اس کا سہرا وہاں کی ورکنگ وومن کے سر پر رکھ دیا۔خیر پھر روس کی خاتون کوبھی بات کرنے کا موقع دیا گیا۔

روسی خاتون نے روس کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ ہمارے ہاں اٹھانوے فیصد خواتین گھر سے باہر نکلتی ہیں، اور شاید یہی ہماری ترقی کا راز بھی ہے۔

تمام ہال تالیوں کی آواز سے گونج گیا، پاکستانی خواتین تو ایسے خوش ہورہی تھیں کہ جیسے "ترقی" کا زینہ ہاتھ لگ گیا ہو۔

روسی خاتون نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا، لیکن ابھی ہمارے پاس دو فیصد گھریلو خواتین ہیں اور مجھے فخر ہے کہ میں بھی ان دو فیصد خواتین میں سے ایک ہوں۔

اچانک تمام ہال پر سناٹا چھا گیا۔

اس نیمز ید بات کرتے ہوئے کہا،"دراصل ہم نے معاشی لحاظ سے تو ترقی کرلی ہے جبکہ معاشرتی لحاظ سے ہمارا معاشرہ تباہ ہو چکا ہے۔شراب نوشی، قتل وغارت، زنا بالجبر اور ڈاکہ زنی عام ہو چکی ہے۔اور ایسا صرف اس لیے ہوا ہے کہ مائیں بچوں کی تربیت نہیں کررہیں، بچے بچپن سے آزاد ماحول میں زندگی گزارتے ہیں جہاں انہیں کارٹون، گیمز اور تفریح کی دوسری چیزیں مہیا کی جاتی ہیں لیکن یہ چیزیں انہیں شدت پسند اور قانون کا باغی بنا دیتی ہیں۔

اب ہمارے معاشرے میں ان عورتوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جو گھروں میں رہتی ہیں اور بچوں کی تربیت کرتی ہیں۔

وہ اور نہ جانے کیا کیا کہتی گئی لیکن سامنے بیٹھی عورتیں ایسے سن رہی تھیں جیسے ہم آپ اپنے ابو،امی یا بڑے بھائی کا پڑھائی کے بارے میں دیا گیا لیکچر سنتے ہیں۔

جس میں وہ کہہ رہے ہوتے ہیں پڑھ لو ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے، اور ہم ان کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔

لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ

ایک عورت کی گود میں جب" بچہ " آتا ہے تو اس پر نبیوں جیسی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے.. ایک ایسا فرض جس میں غفلت کی گنجائش نہیں ہوتی..

جب ایک انسان کو پرورش کیلئے دوسرا انسان دیا جاتا ہے تو گویا ساری انسانیت کی لگام اس کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہیں کہ چاہو تو اسے ابلیس بنادو کہ کل کو ساری انسانیت کیلئے وبال بن جائے.. اور چاہو تو وہ بندہ بشر بنادو جو اپنے آگے پیچھے اور دائیں اور بائیں" خیر" کی روشنی بکھیرتا چلا جائے..

سارے انسان" خیر "ہوتے ہیں.. بس ان کی پرورش کے گہوارے ان کو یا تو پھول بنا دیتے ہیں یا پتھر......!!

☆......☆......☆

فرشتوں کے پروں میں

افشاں نوید۔کراچی

ہر چند سیکنڈ میں وہ اک گہرا سانس لیتی اور اپنے آنکھوں میں آہوں آنسوؤں کو کامیابی سے حلق میں دھکیل دیتی... اک برس سے نہیں دیکھا تھا اپنی عزیز از جان بہن کو.. وقوعہ سے اک روز قبل اسنے جانے کیوں سکوفون کیا وہ تو ہفتوں فون نہ کرتی تھی مصروف اتنا رہتی تھی مگر......

اب کے ماروی سے اپنے آنسو ضبط نہ ہوئے مجھے کیا پتا تھا اسکی آخری کال ہے میں نے فون کاٹ کر ایس ایم ایس کر دیا کہ ابھی خود کال کرلونگی......ہم شہید

مریم بختیار کے ڈرائنگ روم میں دم بخود محو ساعت تھے اسکی اکلوتی دو برس بڑی بہن تعزیت کے لیے آنے والوں کے درمیان بیٹھی ماضی قریب کے ورق الٹ رہی تھیں۔ بولیں یہ تنگ پاجامہ جو میں نے پہنا ہے کہتی تھی باحرمت جانا پہن کر ستر کے تقاضے پورے نہیں کرتا، اورابا جان کبھی تو اسکے ڈر سے قضا ہوتے وقت میں جلدی سے نماز پڑھ لیتے کہ مریم جھگڑا کرے گی نماز قضا ہوتو وہ زیرلب کچھ پڑھتی رہی ہم بات کرتے جواب ندارد......اشاروں میں کہتی ٹھہر جاؤ پھر کہتی درود شریف درمیان میں نہیں توڑتے کھانا کھاتے ہوئے لب ہلتے رہتے امی کبھی کہتیں لوگ کہیں گے جن ہیں لڑکی پر یوں ہر وقت ہونٹ حرکت میں رہتے ہیں تمہارے تو کہتی......درود کیسے چھوڑ دوں اپنی جان سے پیارا ہے مجھے دوران تربیت روزہ رکھنے کی ممانعت ہوتی ہے پائلٹس کو مگر یہاں حکم عدولی کرتی کہ میں اللہ کے آگے کسی کا حکم نہیں مانتی جانے کتنے نفلی روزے رکھتی رہتی۔ فوج کے اعلی عہدے دار کا فون آیا کہ آپ آخری دیدار نہ کرسکیں گے کریش کی صورت میں میت اس قابل نہیں ہوتی......مگر سب حیران کہ چہرہ جسم سب کسی خراش سے بھی محفوظ......امی جان بولیں کہ خراش کیسے آتی اسکو تو فرشتوں نے فوراً پروں میں چھپالیا ہوگا......رندھی ہوئی آواز میں بولے ان شاءاللہ!

☆......☆......☆

ہوا چانک جو ملاقات!

شمیم لودھی

دعوت نامے سامنے تھے اور میری قوت فیصلہ کا کڑا مرحلہ تھا۔ زندگی میں طویل اور مختصر سفروں کا ایک سلسلہ چلتا رہا تھا۔ اب ستارہ ویلی شیخوپورہ روڈ میں آنے کے بعد میری خواہش تھی کہ سفر کم سے کم ہو، یکا یک دعوت نامے آن ٹپکے۔ ایک دو نہیں پورے چار عدد۔ ایک لاہور سے تھا، تین پشاور ائیر بیس سے تھے 1965ء کی جنگ میں شامل ہونے کی بنا پر فاروق صاحب 1964ء میں ائیر فورس میں بھرتی ہو گئے تھے۔ 1985ء میں فلائنگ افسر کی حیثیت سے پشاور ائیر بیس پر خدمات سرانجام دیں تھیں۔ یوں بطور ریٹائرڈ افسر مدعو تھے۔

اُسی ائیر بیس پر بیٹا اب بطور کرنل ڈیوٹی پر تھا کیونکہ حالات کے مطابق آرمی اور ائیر فورس ملکر پشاور آپریشن میں حصہ لے رہے ہیں۔ بار بار بیٹے کا تقاضا تھا ضرور آئیں امی جان، آپ کو 1985ء کی ساتھیوں سے آپ کو ملواؤں گا میں نے کہا بیٹا جی! اس عرصے میں کون کہاں پہنچ گیا ہوگا۔ بہر حال ایسی ترغیبات نے میری ناں کو ہاں میں بدل ڈالا۔ وہاں پہنچ کر معلوم کیا تو ملنے والوں میں سے کوئی کراچی میں تھیں اور کوئی اسلام آباد منتقل ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر نرگس اپنے بیٹے کے پاس بیرون ملک تھیں۔ البتہ عنایت جدون سے ملاقات ہوئی پورے 30 سال کے بعد۔ ان کے ساتھ حمیرا بشیر بھی تھیں دونوں حیات آباد پشاور میں رہتی ہیں۔ بیٹے نے گاڑی ڈرائیور بھیج کر ائیر بیس پشاور پر ہی انہیں بلا بھیجا۔ یوں ملاقات کا مزا دوچند ہوگیا۔

بیٹے نے خصوصی طور پر اپنی ڈیوٹی کے بارے میں بتایا اور اپنے حفاظتی منصوبہ بندی کے چارٹر سے آگاہ کیا۔ عنایت جدون کے سامنے 1985ء کے آٹھ سالہ شرارتی بچے کی بجائے اب ایک چست و توانا طویل قامت آرمی کرنل تھا۔ مسرت کا اظہار تو تھا ہی۔ ساتھ ہی یہ بات کہ دن رات ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ یونیفارم بمشکل چند گھنٹوں کے لئے اترتا ہے۔ میں نے کہا دیکھ لو عنایت بہن تمہاری حفاظت کیلئے کتنی توانائیاں یکجا نظر آرہی ہیں we awake when you sleep ڈیفنس فورسز کا طرۂ امتیاز ہے۔ اللہ رکھوالوں کو بھی اور جن کی حفاظت کی جارہی ہے سب کو حفظ و امان میں رکھے۔ بچانے والی طاقت زبردست اور وہ حدہ لاشریک ہے۔ ہم سب کمزور اور ناتواں بندے ہیں۔ ہمیں توانائی ملتی ہے اللہ کے ذکر سے۔

فوج کا نظم وضبط ہم سب امت مسلمہ کیلئے بہترین مثال ہے۔ سارے ارکان اسلام تقاضا کرتے ہیں کہ نظم وضبط کا ہر مقام پر، ہر وقت خیال رکھنا لازم ہے۔ صف بندی، قطار بندی، ہماری عبادات کی روشن و تابناک خوبیاں ہیں۔ میں یہ سطور تحریر کررہی ہوں تو منیٰ کا سوگوار واقعہ ہو چکا ہے جہاں اور وجوہات ہونگی۔ ایک وجہ نظم وضبط کی کمی بلکہ اس پر عمل نہ کرنا بھی ہے۔ چند لمحات کی بھول ہزاروں شہادتوں تک جا پہنچی۔ زخمیوں کی آہ و بکا الگ ہے۔ اللہ ہمیں اسلام کے سنہری اصولوں کا خوگر بنائے۔ آمین

☆......☆......☆

وہ سب جانتا ہے

ام صائم

کوئی اپنا دوست، ساتھی بچھڑا ہوا جس سے کافی عرصہ سے ملاقات

نہ ہو کبھی اچانک ہمارا دل چاہتا ہے بیٹھے بیٹھے بس ہم فوراً اُس کے پاس چلے جائیں یا وہ ہمارے پاس آ جائے۔ اور کچھ نہیں تو فون ہی کر لے۔

اور جب ہم ایسا کرتے ہیں تو آگے سے کیا ہوتا ہے؟ ارے تمہیں کیسے پتہ؟ میں تمہیں بڑی شدت سے یاد کر رہی تھی۔ کس سے معلوم ہوا میرا تم سے بات کرنے کو کتنا دل چاہ رہا تھا۔ تو یہ ہمیں نہیں یہ ہمارے اللہ کو پتہ ہوتا ہے کیونکہ وہ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے جذبات محسوسات دوسرے تک پہنچاتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ دو سال پہلے میرے ساتھ پیش آیا۔ میں نماز ظہر ادا کر رہی تھی۔ فرض ادا کرتے کرتے مجھے اپنی ایک دوست کی یاد نے اس قدر بے چین کیا کہ فرائض کے بعد باقی نماز ادا کرنا مشکل ہو گیا بڑے صبر سے نماز مکمل کی لیکن دل تھا کہ اُڑا جا رہا تھا سلام پھیرتے ہی میرے قدم خود بخود جاء نماز سے اٹھ گئے اور میں اس کے گھر جانے کے لئے چل دی۔ تسبیحات میں نے راستے میں مکمل کیں یہ میری دوست میرے ساتھ والی گلی میں ہی رہتی تھی اور کافی عرصہ سے اتنی بیمار تھی کہ بستر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ میں جب اس کے گھر پہنچی تو وہ مجھے دیکھ کر رونے لگی اور وہی پہلا سوال تھا۔ تمیں کیسے پتہ چلا میں تمہیں یاد کر رہی ہوں؟

میں نے اُسے تمام واقعہ سنایا تو اس پر رقت طاری ہو گئی میں نے کہا اللہ نے تو کہہ دیا ہے کہ میں شہ رگ سے بھی قریب ہوں۔ بس ہم نے خود ہی اُسے دور کیا ہوا ہے وہ بار بار اپنی رحمتوں کے جلوے بھی دکھاتا ہے لیکن ہم تفکر تدبر ہی نہیں کرتے۔ ایسی باتوں کو عام سی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بہر حال اُس کے بعد ہم نے مل کر چائے بنائی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے اسے کہا تم تیسویں پارے کی آخری دو سورتوں کا ورد رکھا کرو، ان کا ترجمہ و مفہوم بھی سمجھو۔ وہ پھر حیران پریشان ہو گئی کہ میں نے رات خواب میں دیکھا کوئی کہہ رہا ہے تیسویں پارے کی سورت پڑھا کرو لیکن مجھے سورت کا نام سنائی نہ دیا اب حیران ہونے کی میری باری تھی اور میں دل ہی دل میں اللہ کی شکر گزار ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے کہا بس اللہ تعالیٰ نے تم تک بات پہنچانی تھی یہ میری خوش قسمتی کہ اُس نے اس بات کو میرے ذریعے تم تک پہنچا دیا۔

آج بھی جب مجھے یہ واقعہ یاد آتا ہے تو اللہ کی عظمت، اس کی قربت، رحمت، محبت، ہیبت مجھے عاجزی اختیار کرنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ تو کسی کے ذریعے بھی بات پہنچا سکتا تھا لیکن اللہ کی نظر کرم و رحمت مجھ پر ہوئی۔ یہ احساس مجھے گناہوں سے بچنے میں مدد دیتا ہے کہ اللہ کی نظر ہے تم پر، اور ہمیشہ غلط گمان، غلط خیالات، غلط سوچ سے بھی بچاتا ہے کہ اللہ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے

☆......☆......☆

حکمت کے موتی

رفعت اعجاز۔ لاہور

حضرت لقمان علیہ السلام بڑے برگزیدہ انسان تھے۔ اللہ نے ان کو بڑا عزت و احترام بخشا تھا۔ عرب کے لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ حالانکہ آپ ایک حبشی غلام تھے۔ اللہ نے آپ کو ایسی حکمت و دانائی عطا کر رکھی تھی کہ آپ لوگوں کو بڑی کارآمد نصیحتیں کرتے تھے۔ توحید کا سبق دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ سے بہت خوش تھے اسی لئے ان کو فضیلت دیتے ہوئے ان کا نام قرآن پاک میں لیا گیا ہے اور ایک سورت ان کے نام سے نازل فرمائی۔ فرمایا کہ میں نے ان کو حکمت عطا کی تھی۔ حکمت کیا ہے؟ حکمت کا مطلب ہے دانشمندی، جن کلماتِ حکمت کا ذکر اس سورت میں کیا گیا ہے وہ سیدنا لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہے جو کہ اصل میں تمام لوگوں کے لئے ہیں۔

پہلی نصیحت یہ کہ واحد ذات اللہ کی ہے، شرک کبھی نہ کرو کیونکہ یہ بڑا ظلم ہے خود انسان کے لئے اور والدین کی فرمانبرداری کرو لیکن اگر شرک کے لئے کہیں تو ہرگز نہ مانو۔

دوسری: اللہ کے حکیم، محیط اور وسیع ہونے پر ایمان کامل رکھو۔

تیسری: نماز کی پابندی کرو۔

چوتھی: نیک کاموں کا حکم دو اور برے کاموں سے روکو مخلوق کی اصلاح کرو۔

پانچویں: معاشرتی آداب کے بارے میں ہے کہ تکبر سے باز رہو کیونکہ جو ہوش میں ہوں کبھی تکبر نہیں کرتے۔ صبر و ثبات سے کام لو کیونکہ صبر زندگی کے مقصد کے دروازے کھولتا ہے۔ صبر کے سوا اس دروازے کی کوئی چابی نہیں۔

چھٹی: زمین پر اکڑ کر مت چلو کیونکہ اکڑ کر چلنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔

ساتویں: آہستہ آواز سے بات کرو کیونکہ سب سے مکروہ آواز

گدھے کی ہے۔

اس کے علاوہ سید لقمان رحمتہ اللہ علیہ نے حکمت کی تعریف ان الفاظ میں بھی کی ہے ''سچ بولنا' فضول باتوں سے بچنا، نگاہ کو پست رکھنا، حلال روزی پر قناعت کرنا، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنا، سچائی پر قائم رہنا، عہد کو پورا کرنا، مہمان کا احترام کرنا، پڑوسی کی حفاظت کرنا، فضول کام اور فضول کلام کو چھوڑ دینا۔'' (ابن کثیر)

حکمت مسلمان کی میراث ہے، جہاں سے بھی ملے حاصل کرلے۔ یہ حکمت کے موتی کسی خاص فرد کے لئے نہیں بلکہ ہر خاص و عام ان کو اپنا کر دنیا و آخرت کما سکتا ہے اور اللہ کا مقبول انسان بن سکتا ہے اور یہی ہے معراجِ انسانیت۔ اللہ ہم سب کو توفیق دے۔ آمین

☆......☆......☆

خالص ہی سب کچھ ہے!

صائمہ وحید۔ کراچی

ہماری امی فرماتی ہیں ایک وقت تھا ہر چیز خالص ہوتی تھی۔ اصلی گھی، دودھ، اور صحت اچھی۔ اب ہر چیز میں ملاوٹ ہونے لگی ہے۔ دودھ میں پانی کی ملاوٹ، پانی میں جراثیم کی، پھلوں، سبزیوں میں کیمیکل، سرکاری، قومی اداروں میں نااہل افراد کی ملاوٹ، سچ میں جھوٹ کی ملاوٹ، اخلاق میں ریاکاری، خوشامد، مفاد پرستی کی ملاوٹ، نیت میں لالچ، حرص و ہوس کی ملاوٹ، خلوص میں دھوکہ کی، کلچر، ثقافت اور تہذیب میں بے حیائی کی ملاوٹ، تعلیمی اداروں میں، تعلیم میں ملاوٹ، میک اپ میں نقصان دہ کیمیکل کی ملاوٹ جو خواتین پر ظلم ہے۔

ہم اپنے لئے سب کچھ خالص پسند کرتے ہیں۔ اللہ کو بھی خالص توبہ پسند ہے اور خالص اللہ کا رنگ اختیار کرنا پسند ہے۔ خالص نیت، ہر کھوٹ سے پاک...... خالص میں ہی سب کچھ ہے۔ ترقی، امن، سکون، استحکام، صحت، جنت۔

ہمارے نبیؐ مہربان کیسے تھے؟ امین اور صادق...... تبھی آپؐ کے جانشینوں نے 800 سال دنیا پر حکومت کی۔ ہم آپؐ سے محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر ہماری محبت میں بھی ملاوٹ ہے۔ دودھ میں پانی سے دودھ کی مقدار اور گوشت میں پانی کے پریشر سے گوشت کے وزن میں اضافہ ممکن دنیا بنانا آسان۔ مگر آخرت تو اللہ کے خوف سے نکلے ہوئے خالص آنسو سے بنتی ہے۔

بے شک خالص ہی سب کچھ ہے۔ مگر کچھ لوگ ملاوٹ کے اس قدر عادی ہیں کہ انہیں خالص غذا، خالص لوگ، خلوص راس نہیں آتا۔ ان کے پیٹ میں مروڑ اور دماغ میں شور اٹھنا شروع ہوجاتے ہیں۔ انکا کیا کیا جائے؟ یہی تو ازل سے ابد تک کی جنگ ہے کہ کون خدا کی خالص بندگی کرتا ہے؟

☆......☆......☆

آنسو

یہ نرم گرم قطرے
جب نکل کر آنکھوں سے
رخساروں پر بہہ جاتے ہیں
تو جیسے
ساری ہمت بہالے جاتے ہیں
اور ہمیں توڑ کر رکھ دیتے ہیں
یہی آنسو اگر رک رک کر
دل پر گرتے جائیں
تو جیسے اندر زخمی کرتے جاتے ہیں
کسی نوک دار پتھر کی طرح
دل میں پیوست ہوجاتے ہیں
اور پھر
سال ہا سال کیلئے
ناسور بن جاتے ہیں
تو پھر
تم ہی بتاؤ ہمدم
اس دکھ کا علاج کیا ہو؟

☆......☆......☆

ڈاکٹر شازیہ عاشق

تبصرہ کتب

(۱)

نام کتاب: سوعظیم مسلم خواتین

مصنف: میر بابر مشتاق

قیمت: 495روپے،صفحات ۴۶۴

ناشر: عثمان پبلی کیشن،کراچی

برائے رابطہ 0364-4874074, 05-2659625

جدید دور میں مغربی معاشرے نے عورت کو نام نہاد آزادی دی ہے جو جنسی بے راہ روی اور ذہنی انتشار جیسے نتائج کا باعث بن رہی ہے۔اس کے برعکس مسلم معاشرہ ہمیں زندگی کے تمام شعبہ جات میں اخلاقی قدروں سے روشناس کراتا ہے اور مسلم مرد و عورت کے لئے کچھ اخلاقی حدود کا تعین بھی کرتا ہے تاکہ معاشرے کی ہمہ پہلو ترقی ممکن ہو سکے۔

میر بابر مشتاق کی زیر تبصرہ کتاب ''سوعظیم مسلم خواتین'' اسی پس منظر میں لکھی گئی ہے۔اسلام کے دور اول سے لے کر آج تک ایسی بہت سی عظیم خواتین اور ان کے کردار ہمارے سامنے مشعل راہ ہیں جن کے نقش قدم پر چل کر ہم جدید دور کی اخلاقی پستیوں سے نکل سکتے ہیں۔ان خواتین کا کردار و عمل ہمارے لیے قابلِ تقلید ہے۔

کتاب میں ازواج وامہات انبیاء، امہات المومنین ،بنات رسولؐ ، نبیؐ کی جلیل القدر صحابیات ،تابعات ،راہ حق کی مسافرات اور پاکباز اور عظیم المرتبت بیویوں اور نو مسلم خواتین کے ایمان لانے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے واقعات کا تذکرہ ہے۔معلومات عرق ریزی سے جمع کی گئی ہیں اور آخر میں حوالہ جات اور ماخذات درج کیے گئے ہیں۔ البتہ حضرت حواؑ کے بارے میں مضمون اسرائیلی روایات سے متاثر ہے جن میں سے بعض کی قرآن نہ صرف یہ کہ تائید نہیں کرتا بلکہ تردید بھی کرتا ہے۔

(۲)

نام کتاب: سوعظیم مسلم شخصیات

مصنف: میر بابر مشتاق

ناشر: عثمان پبلی کیشن کراچی

قیمت:40روپے،صفحات ۴۹۶ برائے

رابطہ 0364-4874074, 05-2659625

ایک وقت تھا کہ مسلمان دنیا کی غالب قوت تھے۔بعد میں آنے والے ادوار میں جب امت مسلمہ میں اخلاقی قدریں روبہ زوال ہوئیں تو مغرب نے مسلمانوں کے علوم سے فائدہ اٹھا کر تمدنی ترقی کی منازل طے کیں۔اور مسلمان جو کبھی علوم وفنون میں دنیا کی رہنمائی کرتے تھے، اپنی سستی و کاہلی کی وجہ سے ان کے مقلد ہو گئے۔ہماری نوجوان نسل کے لیے ہمارے اسلاف کے وہ کارنامے جاننا بہت ضروری ہیں جو مغربی سازشوں کے تحت ہمارے نصابوں سے اٹھا لیے گئے ہیں۔وجہ یہ کہ دنیا کو یہ باور کرایا جائے کہ اس وقت دنیا میں جو ترقی ہو رہی ہے وہ مغرب کی ہی مرہون منت ہے۔جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔مسلمانوں نے ہی علوم وفنون اور سائنس کو ترقی دی جس پر اہلِ مغرب نے اپنی تمام تر ترقی کی بنیاد رکھی۔ یہ حقیقت جاننا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ بطور مسلمان ہمارے اندر احساسِ زیاں پیدا ہو اور ہم اپنا کھویا ہوا علمی مقام حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

زیر تبصرہ کتاب ''سو مسلم عظیم شخصیات'' میں میر بابر مشتاق نے ان سوعظیم مسلم شخصیات کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اسلام کی سربلندی،احیاء

اور سائنسی کارناموں کے حوالے سے تاریخ میں اپنا نام رقم کیا۔ مگر بدقسمتی کہہ لیجئے کہ ہم ان عظیم ہستوں کے کارناموں سے بالعموم ناواقف ہیں۔

میر بابر مشتاق کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اس کو کما حقہ پورا کیا۔ اس کتاب میں انہوں نے تاریخ اسلام کی نامور شخصیات جن میں صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، علماء محقق، مجدد اور مفسرین قرآن، صوفیا عظام، مجاہدین اسلام، امراء، سلاطین، اور مسلم سائنس دانوں اور سیاحوں کے کارناموں پر فرداً فرداً روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب ملت اسلامیہ کے احیا کے لیے کام کرنے والی مسلم شخصیات کے کردار کو اجاگر کرتی ہے۔ بنیادی مقصد نوجوانوں میں اخلاق اور کردار کے حوالے سے وہ خصوصیات پیدا کرنا ہے جو ہمارے اسلاف کا طرہ امتیاز تھیں اور اس کے ساتھ وہ تعمیری سوچ پیدا کرنا ہے جس سے ہم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کرسکیں۔ میر بابر صاحب کی یہ کاوش قابلِ تحسین ہے۔

☆......☆......☆

خاتونِ اول

انسان کی فطرت میں مسابقت کا جذبہ رکھا گیا ہے، تاکہ وہ اپنی منزل کی جستجو میں لگا رہے معاشرے میں ہر دو صنف اس دوڑ میں شامل ہیں کہ اپنے اردگرد کے ماحول میں اسے نمایاں مقام مل سکے،"سب سے پہلے میں" کے پیش نظر ہر فرد اپنی استعداد سے بڑھ کے دوسرے سے بہتر پوزیشن پہ آنا چاہتا ہے. خاندان برادری کے "بڑے" کہلانا ، محلے، کالونی کا سرکردہ بننا یہ خواہش ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے تک جا پہنچتی ہے. پہلے نمبر پہ آنا اور اس پہ قائم رہنا ہر کسی کی آرزو ہوتی ہے. خواتین میں یہ جزبہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے لیکن اس کا دائرہ حسن و جمال زیور کپڑے سے شروع ہوتا ہے اور اپنے شوہر کے " دائرہ اختیار " کے احساس تفاخر پہ جا پہنچتا ہے ہر عورت اپنے شوہر کے حوالے سے اپنی سوسائٹی میں معتبر گردانی جاتی ہے شوہر کے مقام و مرتبہ میں بیوی کچھ زیادہ ہی حصہ پاتی ہے فی زمانہ ملک کا سربراہ تو "مرد اول" نہیں کہلاتا مگر بیوی ''خاتون اول'' ضرور بن جاتی ہے اگرچہ وہ کسی بھی شمار قطار میں آنے کے قابل نہ ہو. اسلامی معاشرے میں دنیاوی جاہ وحشمت اور تخت وتاج کی کوء اہمیت نہیں ہے. تقوی ہی اکرام وتعظیم کا معیار ہے. یہاں تو ''سید القوم خادمھم'' کا شعار سکھایا جاتا ہے اور مسابقت میں پہلے نمبر پہ آنے کا وہی پیمانہ اور معیار رہے گا جو خالق کائنات نے مقرر کر دیا ہے.

اللہ رب العزت نے جس کی مدح سرائی کی وہی مومنوں کے لئے قابل تعریف ہے. امت مسلمہ نے اگر مروجہ القاب سے کسی شخصیت کو یاد کرنا ہی ہے تو اس کی ایک ہی شرط رہے گی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات سے نہ ٹکراتا ہو.

مسلمان معاشرے میں اپنے کردار کی سند ہی پیش کی جاتی ہے. اور یہی اللہ تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہے کہ "کلء امری بما کسب رھین اور اللہ تعالیٰ کے ضابطے بدلا نہیں کرتے.

خاتونِ اول بننے کا اعزاز اسی کو حاصل ہو سکتا جسے اللہ تعالیٰ خود یہ اعزاز عطا فرمائے

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ان لمحات کا تصور کریں جب آپ ﷺ نے سیدہ خدیجہؓ کو اپنی شریک حیات بنانے کا فیصلہ کیا تو اللہ رب العالمین کی تائید شامل حال تھی. اللہ تعالیٰ کو ہی اس بات کا علم تھا کہ جو بھاری ذمہ داری اپنے نبی پہ ڈالنی ہے اس میں کیسی تسلی وتشفی درکار ہوگی اور اس کام میں کس عظیم حوصلے اور وسیع القلبی سے مال خرچ کرنے کی ضرورت ہوگی اور شریک زندگی کو حسن سیرت کا مان بڑھانے کے لئے کون بہترین الفاظ ادا کر سکتی ہے. .یقیناً لفظوں کی تاثیر سے دل فتح کیے جا سکتے ہیں خدیجہ رضی اللہ تعالی عام عورت نہیں تھیں وہ رب کائنات کی منتخب کردہ نبی کی ساتھی تھیں ان کی زندگی کا مقصد نبی اکرم صل اللہ علیہ وسلم کے مشن کی بنیادیں مضبوط کرنا تھا، اور یہ کام انہوں نے بدرجہ اتم پورا کر کے دکھایا۔

وہ خاتون اول ہیں اس لئے کہ اللہ رب العلمین کی طرف سے مبعوث کردہ رحمھ اللعالمین کی تصدیق اس وقت کی جب وہ خود فکر و تردد اور تشویش کی جسمانی اور ذہنی کیفیت میں مبتلا تھے. "مجھے اوڑھا دو، مجھے اوڑھا دو" کہتے ہوئے بے قراری کے جو ناقابلِ بیان احساسات و جزبات تھے اس وقت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا نے اپنے شوہر کی حسن سیرت پہ محبت اور حوصلے کی ردا بھی اوڑھا دی. اور مزید تصدیق کے لئے اپنے معاشرے کے بہترین آدمی کے پاس لے کر گئیں. حضورؐ ابھی اپنی ذمہ داری کے منصب کو سمجھنے کی کیفیت میں تھے اور اللہ کی بندی خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا ان کی زندگی کی ساری سچائیوں کی گواہ تھیں اسی لئے

اللہ کی نظر میں ان کے شوہر کا جو اعلیٰ مقام تھا اس کی نشان دہی کر رہی تھیں اور گواہی دے رہی تھیں یہ گواہی ثابت کر رہی تھی کہ وہی خاتونِ اول تھیں اور ہمیشہ رہیں گی سب سے پہلے ایمان لانے تصدیق کرنے کا جن کو اعزاز ملا.

یہی وہ خاتون تھیں جو اللہ سبحان وتعالیٰ کے محبوب بندے کے بچوں کی ماں بنی. اپنے شوہر کے گھر کی بلاشرکت غیرے مالک رہیں. ان کی لخت جگر جنت کی عورتوں کی سردار ہوں گی اور کرہ ارضی کی واحد نانی ہیں جن کا نواسا جنت کے نوجوانوں کا سردار منتخب کیا گیا۔

یہی وہ خوش قسمت پہلی خاتون ہے جس کو اللہ رب العزت نے مکرم فرشتے کے ذریعے سلام کا تحفہ بھیجا اور جنت میں سفید موتی کے خوب صورت محل کی خوشخبری سناء. بے شک اللہ تعالیٰ نے اس جزبے، خلوص کی قدردانی کی جس کے تحت اللہ کی بندی نے داعی اعظم کے گھر کو امن سکوں محبت کا گہوارہ بنائے رکھا یقیناً اللہ تعالیٰ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

اگر خاتون اول ہونا شوہر کے صاحب اختیار واقتدار یا کسی قوم کا امام ہونے سے مشروط بھی ہو تو امام الانبیاء سے بڑھ کر کس کا مقام ہوسکتا ہے؟ ایسے امام کی سب سے پہلی شریک زندگی ہونا اللہ رب العزت کی طرف سے خاص اکرام ہے۔

عمر میں اپنے شوہر سے پندرہ سال بڑی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے چنیدہ پیارے بندے کے دل کی ملکہ رہیں، ایسی کہ وفات کے بعد بھی کم عمر اور کنواری بیوی ہمیشہ ان پہ رشک کرتی رہیں۔ سیدنا محمدؐ کا دل ان کی محبت سے ہمیشہ لبریز رہا اور اس محبت کا تذکرہ کرنا حضورؐ کو زندگی بھر محبوب رہا اور کیوں نہ ہوتا وہ اللہ رب العزت کے ہاں وہ عالی شان مقام پا چکی تھیں اپنا مال ومنال نبی کی عظمت پہ قربان کر چکی تھیں وہ دمساز و رفیق تھیں اس وقت جب کوئی پرسان حال نہ تھا شعب ابی طالب کی گھاٹی کی صعوبتیں ہوں یا گلیوں بازاروں میں آوازیں کسنے اور اذیتوں کے نت نئے منصوبے بنانے والوں کا سامنا کرنے کا مرحلہ، یہی وہ غمخوار تھیں جن کی رفاقت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم راحت وسکون پاتے تھے۔ پہلی ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روحانی اولاد اپنی ماں کے خوبصورت سفید محل میں ملاقات کی کیا تیاری کر رہی ہے؟ جہاں امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما ہوں گے اور خواتین جنت کی سردار بھی آتی ہوں گی اپنے عظیم بیٹوں کے ساتھ جو نوجوانوں کے سردار ہیں۔ کیا ہی اچھی رفاقت ہوگی اور کیا ہی اچھا مقام سبحان اللہ، سبحان اللہ!

اللھم اجعلنا منھم آمین۔

☆......☆......☆